ادارہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ۔ ضلع چکوال

اذکار و اشغال کی حقیقت

تصوف اور تعمیرِ سیرت

تالیف

حافظ عبدالرزاق ایم اے

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان ○ منارہ ○ ضلع چکوال

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ و نصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلی آلہٖ

منارہ کے سالانہ تربیتی اجتماع کے موقعہ پر حضرت حافظ عبدالرزاق صاحب مدظلہ العالی نے سلوک و احسان کی حقیقت، مقصد و مدعا کے موضوع پر جو تقاریر فرمائیں، پیشِ نظر گلدستہ انہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جو قارئینِ کرام کی نظر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلسِ ذکر (۱)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ کہ طرز بُودو باش کے اعتبار سے لوگ دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اوّل وہ جن کا نظریہ ہوتا ہے "تو بازمانہ بساز" یعنی "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ ایسے لوگ کوتاہ اندیش تو ہوتے ہیں۔ مگر اکثریت میں ہوتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس میں محنت کم ہوتی ہے جیسے دریا کے بہاؤ کے رُخ تیرنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا نظریہ یہ ہوتا ہے۔ "اگر زمانہ با تونسازد تو زمانہ ستیز" یہ کام ذرا مشکل ہے۔ خصوصاً جب دریا طغیانی پر ہو اور بہاؤ کے رُخ کے خلاف تیرنا پڑے تو جان کھپانی پڑتی ہے۔ ایسے لوگ یقیناً بلند ہمت اور دُور اندیش ہوتے ہیں۔

جب کسی معاشرے میں خدا بیزاری کا سیلاب آچکا ہو اس میں خدا لگتی کہنا یا نفس کی خواہشات، لذت پرستی اور رسم و رواج کے خلاف اللہ سے رشتہ جوڑنے کی فکر کرنا تو خواہ مخواہ نکو بننا ہوتا ہے۔ اس لیے غالب امکان ہے کہ آپ کے احباب اور رشتہ دار آپ سے سوال کرتے ہوں گے کہ آپ "منارہ" کیوں جاتے ہے

ہیں یا ہر سال کیوں جاتے ہیں۔ ایسے سوالات کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ وہ حقیقت جاننا چاہتے ہیں بلکہ آپ کو اس کام سے روکنا یا کم از کم تردّد پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اس امر کا بھی امکان ہے کہ خود آپ کے اندر سے کبھی ایسا سوال اُبھرے ایسے حالات میں اگر آپ اپنے مقصد سے شعوری تعلق اور قلبی لگاؤ رکھتے ہیں تو اپنے آپ کو مطمئن کر ہی لیں گے مگر ممکن ہے احباب کو مطمئن کرنا آپ کے بس کی بات نہ ہو۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنا آپ کے لیے ضروری ہے۔ سادہ سی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے اپنے ربّ سے شناسائی حاصل کرنے کے لیے اسی کا بتایا ہُوا نسخہ یعنی ذکرِ الٰہی شروع کر دیا ہے اور یہاں ہر سال اس فن کا ریفریشر کورس ہوتا ہے تاکہ اس کام میں تازہ لگن پیدا ہو۔ اس سلسلے میں مزید ہدایات حاصل کی جائیں۔ اپنی گذشتہ محنت کا جائزہ لیا جائے اور آئندہ کے لیے محبّت سے کام کرنے کا سلیقہ سیکھا جائے مگر خدا بیزار ماحول میں یہ کام بالکل اجنبی سا لگتا ہے لہٰذا آپ کو اس ذہنی دباؤ اور اس تہذیبی یلغار کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

ذکرِ الٰہی بذاتِ خود مقصد کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ربِّ کریم نے اپنی آخری کتاب میں بار بار صرف اس کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ اکثر مقامات "پر کثیر" کی قید بھی لگا دی اور بندہ کا کام آقا کے حکم کی تعمیل کرنا ہی ہوتا ہے بلکہ تخلیق انسانی کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ "جو میں کہوں وہی کرو۔"

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱-۵۶)۔ یہی خلاصہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے قُربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے اور قربِ الٰہی کا حصُول اعلیٰ ترین مقصد ہے بلکہ اصل مقصد ہی یہی ہے اسی کا نام درجۂ احسان ہے۔ اِسی کے لیے تصوّف وسلوک

کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

کچھ سادہ لوح اس مشکل میں پھنس جاتے ہیں کہ تصوّف وسلوک کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھی بات ہے کہ آدمی ہر معاملے میں محتاط روش اختیار کرے اور بلا سوچے سمجھے اور بلا دیل کسی بات پر یقین نہ کرے مگر اس لحاظ سے یہ سوال بڑی جرأت کا اظہار ہے۔ اللہ کی کتاب۔ اللہ کے رسول کا اسوۂ حسنہ اور صلحائے اُمت کے صدیوں کے تعامل سے صرفِ نظر کر کے ہی آدمی یہ اقدام کر سکتا ہے۔

کتاب اللہ میں قربِ الٰہی حاصل کرنے کا حکم موجود ہے اور حکم بھی واضح کہ وَاقْتَرِبْ (۹۶:۱۹) دوسرے مقام پر اہلِ قرب کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے کہ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۵۶:۱۰) (اور آگے بڑھنے والے وہی تو مقربین ہیں۔) "آگے بڑھنے والے" کا لفظ نہایت دقیق مفہوم کا حامل ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان بزبانِ حق نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم۔

من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیتہ ھرولہ ۔ "جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آیا میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں۔ اور جو میری طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اس کی طرف ایک کلاچ (کھلے ہوئے دو ہاتھ) آتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔"

معلوم ہوا کہ قربِ الٰہی کا حصول اللہ اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک بڑا پسندیدہ عمل ہے۔ بلکہ یہی تو شرفِ انسانیت ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کا فائدہ کیا ہے تو ارشاد ہوتا ہے۔

ولا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الّذی یبصربه ویده الّتی یبطش بها ورجله التی یمشی بها۔ (بخاری)

یعنی "میرا بندہ برابر مجھ سے نوافل کے ذریعے قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ جب میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے اور اس کی بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔"

بیان کا یہ ایک خاص اسلوب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر اس کے اعضاؤ جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔ گویا میں ہی اس کے اعضا بن جاتا ہوں اس سے ظاہر ہُوا کہ قربِ الٰہی کی علامت یہ ہے کہ آدمی اپنی عملی زندگی میں اللہ کی رضا کے خلاف کوئی کام کرنے کی ہمت نہیں پاتا جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ قربِ الٰہی کا انسان کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اتنا گہرا کہ اس کی وجہ سے انسان کی عملی زندگی اتنی معتدل متوازن اور مثالی بن جاتی ہے کہ ہر کام میں وہ رضائے الٰہی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ بظاہر کام دُنیا کے کر رہا ہوتا ہے مگر حقیقت میں اللہ کی رضا کے تحت کام کرکے اپنی اُخروی زندگی کو سنوار رہا ہوتا ہے اس سے یہ غلط فہمی اصُولی طور پر تو دُور ہو گئی کہ قربِ الٰہی کے حصُول میں پڑ کر یا تصوف و سلوک اختیار کرکے انسان دُنیا کے کام کا نہیں رہتا۔ اس حدیث سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا بندہ بن کر دُنیا میں رہنے کا سلیقہ ہی تصوّف و سلوک کے ذریعے آتا ہے گویا تصوّف و سلوک کا قرآنی نام "قرب" ہُوا۔

اس حدیث قدسی میں تقرب کا ذریعہ نوافل بیان ہُوا ہے اور نوافل کی کوئی حد

ہیں اس لیے تقرب کی بھی حد نہیں مگر نوافل کی اس وسعت کے پیشِ نظر انسانی ہمت کی کمی اور عجز بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اس معمہ کا حل ارشاد ہوا ہے۔

عن عبد اللہ بن بسر ان رجلا قال یا رسول اللہ ان شرائع الاسلام قد کثرت علی فاخبرنی بشیئ اتشبث به قال لا یزال لسانك رطبا من ذکر اللہ (الترمذی)

یعنی صحابی نے عرض کیا کہ فرائض تو محدود ہیں مگر نوافل عبادات کی اتنی کثرت ہے کہ میں اپنے اندر تمام عبادات نافلہ کی ہمت نہیں پاتا اور اس کا شوق چین نہیں لینے دیتا۔ اس لیے کوئی ایسی تجویز فرمائیں کہ میرا شوق بھی پورا ہو جائے اور عبادات نافلہ کی ادائیگی میں کمی بھی نہ رہے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ اس کے لیے جامع اکسیر یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے ہمیشہ تیری زبان تر رہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ قربِ الٰہی کے حصول کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا جامع نسخہ ذکرِ الٰہی ہے اور دوامِ ذکر ہے۔

قرب کا لفظ زبان پر آتے ہی بُعد کا تصور پیدا ہو جاتا ہے یعنی یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے جس کا قرب حاصل کرنا ہے اس کے اور میرے درمیان بُعد ہے۔ کچھ فاصلہ ہے جو مجھے طے کرنا ہے۔ اس فاصلہ کو طے کرنے اور اس راہ پر چلنے کا نام ہی سلوک ہے اور چلنے والے کو سالک کہتے ہیں۔

یہاں ایک مشکل پیش آتی ہے۔ جس کا اکبر الہ آبادی نے ذکر کیا ہے۔ ع

غلط فہمی بہت ہے عالمِ الفاظ میں اکبؔر

بُعد قرب اور فاصلہ کے الفاظ کے ساتھ یہ تصور اُبھرتا ہے کہ جس کا قرب حاصل کرنا ہے وہ کوئی مجسم وجود ہے اور اس کا کوئی خاص مقام ہے جہاں پہنچ کر قرب حاصل ہو گا۔ مگر اللہ تعالیٰ تو جسم اور مکان سے پاک ہے لہٰذا

یہاں قرب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اتصال ہو جائے۔
قرب کی ایک اور قسم ہے کہ خصوصی تعلق پیدا ہو جائے۔ حجابات کم ہو جائیں یا رفع ہو جائیں۔ جیسے ہم اُردو میں کہتے ہیں" تم تو دُور رہ کر بھی پاس ہی ہو" یعنی تمہارے ساتھ ہمارے دل کا خصُوصی تعلق ہے جیسے مولانا حالی نے کہا ؎

گھر دل میں ہو یا روں کا تو گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بنایا

حدیث قدسی میں اس قرب کی حقیقت بیان فرما دی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا خصوصی تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ انسان کے اعضاء وجوارح محبُوب کی رضا کے خلاف کوئی کام کر نہیں پاتے گویا انسان اپنی پسند اور اپنے ارادے کو اللہ کی پسند اور اس کی رضا میں فنا کر دیتا ہے گویا وہی اس کے اعضاء بن جاتا ہے۔
ہماری روزمرّہ کی زندگی میں دنیوی ضروریات پوری کرنے کے لیے صاحب منصب اور صاحبِ اثر لوگوں کا قرب حاصل کرنے کا ایک معروف طریقہ ہے۔ جب کسی کا قرب حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے تو آدمی سب سے پہلے یہ سوچتا ہے اسے کونسی بات یا کونسی چیز پسند ہے کس بات سے وہ ناخوش ہوتا ہے اور کونسا کام اسے ناپسند ہے یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد آدمی کوشش کرتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ خوش کرے۔ اس کی رضا حاصل ہو جائے تو کام بن جائے گا۔ اس غرض کو پُورا کرنے کے لیے بڑی محنت کرتے ہیں مجاہدے کرتے ہیں اپنی پسند کے خلاف کام کرتے ہیں بلکہ ہر قسم کا ایثار کرنے پر آمادہ رہتے ہیں کیونکہ ہمارا مقصد اس ہستی کا مقرب بننا ہے جس کے ساتھ ہماری ضرورتیں وابستہ ہیں۔ اور مشاہدہ یہی ہے کہ یہ طریقِ کار نہایت کامیاب طرزِ عمل ہے۔
اس تجربہ سے فائدہ اُٹھایئے۔ جب ہمارے سارے کام دنیوی ہوں یا اُخروی

ظاہری ہوں یا باطنی اس ہستی سے وابستہ ہیں جو اس کائنات کا نظام چلا رہی ہے اور جب یہ معلوم ہو چکا کہ اس کا ذکر اور ذکرِ دوام ایسا ذریعہ ہے کہ اسے بہت زیادہ پسند ہے تو اس راہ پر چلنے سے پہلے یہ طے کر لینا چاہیئے۔ کہ ذکرِ الٰہی کی غرض محض اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ جب وہ راضی ہو جائے گا۔ تو مقرب بنا لے گا۔

دوسری بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ یہ فاصلہ صرف اپنی ہمت سے طے نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کی بندہ نوازی اور رحمت سے ہو گا۔ جیسا کہ حدیث بالا کے مضمون سے ظاہر ہے۔ کہ بندہ کی طرف سے ذرا سی کوشش ہوتی ہے تو اس کی طرف سے اس سے کئی گنا زیادہ قرب ہوتا ہے اس لیے اس سفر میں بندہ کی طرف سے خلوص کے ساتھ اس کی طرف چل پڑنا ہے۔ اصل کام تو اس کے جذب کشش اور رحمت سے ہوتا ہے۔ دیکھئے یہاں کتنے نوجوان بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے ماحول پر نگاہ کریں۔ ان کی عمر کے لوگ سینماؤں میں کلبوں میں عیاشیوں میں فحاشیوں میں اور آوارہ گردی میں مگن ہیں مگر یہ یہاں بیٹھے ہیں اس ماحول کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ تو کیا وہ خود آئے ہیں نہیں اُنہیں لایا گیا ہے اس کی رحمت نے انہیں اس دلدل سے نکالا ہے اپنی طرف متوجہ کیا ہے، اور اپنے گھر میں لا کر اپنے نام اور اپنی یاد کا چسکا لگا دیا ہے اس کی عنایت ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے آپ کو اپنے لیے چُن لیا ہے اس کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے تو اس پر اِترانے کا کوئی مقام نہیں کہ ہم نے یہ تیر مارا۔ اِترائے وُہ جو خُود کام کرے، مگر جس سے کام لیا جائے وہ اِترائے کس پر۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ۔ (۷:۴۳) (ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اِس سے ہدایت دی اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم خود ہدایت نہ پا سکتے۔)

کسی معمولی سے کام کے مختلف مدارج پر غور کرو۔ مثلاً آپ یہاں آئے تو

گھر سے چلنے سے پہلے ارادہ ہُوا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آپ گھر میں ہی بیٹھے رہتے
مگر یہ ارادہ کس نے پیدا کیا اسی نے جس نے آپ کی سوچ کا رُخ بدلا۔ جس
نے آپ کو ایک منزل کی خبر دی جس نے آپ کے اندر اس کا شوق پیدا کیا
اسی نے یہ ارادہ بھی پیدا کیا لہٰذا یہ تمام تر اسی کا احسان ہے۔ اپنے آپ کو
حجاب نہ بناؤ درمیان سے ہٹا دو۔ ع

تو خود حجاب خودی حافظا مخروش

دوسری بات جو نئے ساتھیوں کے لیے یہاں آکر باعثِ تعجب بنتی ہے اس
کا بیان ضروری ہے۔ جب ذکر شروع ہوتا ہے تو شیخ المکرم کہتے ہیں۔ چلو لطیفۂ قلب
چلو مراقبات ثلاثہ وغیرہ تو وہ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ کیا پہیلی ہے کہ بیٹھے بھی ہیں
اور چلتے بھی ہیں۔ چلنے سے بلاشبہ راستہ طے ہوتا ہے۔ مگر کوئی چلے بھی۔ یہ بیٹھے بیٹھے
چلنے کا کیا مطلب ؟ تو اس کی حقیقت سمجھ لیجئے۔ ذکرِ الٰہی، قربِ الٰہی کا ذریعہ
ہے اور اس کی ذات بے چون و بے چگون ہے وہ لا مکان ہے اور جسمِ انسانی
خاکی اور مادی ہے اس جسم کو اٹھا کے آدمی لے جائے بھی تو کہاں ؟ لہٰذا یہ چلنا
اس جسم کا چلنا نہیں بلکہ اس جسم کے اندر اصل انسان چھپا ہُوا ہے جو اس کی
رُوح ہے۔ یہ سفر رُوحانی ہے یہاں رُوح کا چلنا ہے منزل کی طرف بڑھنا
ہے۔ قربِ الٰہی حاصل کرنا ہے اور یہ لطائف اور مراقبات اور مقامات اسی
رُوح کے سفر کے دوران اس کی مختلف منزلیں ہیں جب رُوح اپنے محبوب
سے آشنا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر چلنے اور بڑھنے کی طاقت پیدا ہو
جاتی ہے۔ شوق اُبھرتا ہے۔

اس مقام پر ایک اور شبہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ چلو قربِ الٰہی اور
رضائے الٰہی کے حصُول کا ثبوت تو قرآن و سنّت سے مل گیا مگر ان مقاماتِ سلوک

کا ثبوت کہاں ہے ان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال اطمینانِ قلب کے لیے ہو۔ تو چنداں مضائقہ نہیں مگر عموماً دیکھا گیا ہے کہ یہ سوال چلنے والوں کی راہ روکنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے حُسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے اس کی پہلی حیثیت ہی کے پیشِ نظر یہ اشکال یا اس قسم کے دوسرے شبہات کا حل تلاش کرنے کے لیے ایک اصُول سمجھ لیجئے۔ ایک ہوتا ہے۔ غایت یا مقصُود۔ دوسرا ہے اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے تدبیر یا ذریعہ۔ پھر اس تدبیر کی تقویت کے لیے کچھ ذیلی ذرائع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ لاہور سے کراچی جانا چاہتے ہیں آپ کو سواری مل گئی۔ راستہ متعین ہے آپ چل پڑے ہیں۔ سفر طویل ہے آپ سفر کر رہے ہیں۔ مگر طبیعت یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ کتنا سفر طے ہو گیا۔ بے اختیار آپ کی نگاہ سڑک پر نصب سنگِ میل پر جا پڑتی ہے آپ دیکھ لیتے ہیں کتنی دُور پہنچ گئے کتنا سفر طے کر لیا، آپ کو تسلی ہو جاتی ہے۔ حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سنگِ میل نہ ہوں تب بھی آپ کا سفر تو جاری رہ سکتا ہے پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ مگر اپنے دل سے پُوچھئے کہ یہ سنگِ میل آپ کے سفر کو کتنا خوشگوار بنا دیتے ہیں: اب کوئی سنگِ میل کا ثبوت پُوچھنے لگے تو آپ کیا کہیں گے یہی نا! کہ ؎

ترا کہ ہے گریبانے نشد چاک
چہ دانی لذتِ دیوانگی را

اور اگر یہی سنگِ میل سڑک کے وسط میں گاڑ دیئے جائیں تو وہ معاون کیا اُلٹا رکاوٹ بن جائیں گے۔

اس مثال کی روشنی میں اپنے رُوحانی سفر کو دیکھئے۔ سلوک کے معنی چلنا ہے کس طرف؟ قربِ الٰہی کی طرف۔ اللہ کی رضا کی طرف۔ راستہ بڑا طویل

ہے پوری عمر کا سفر ہے مگر اس راستے پر کوئی سنگِ میل نہ ہو تو جی گھبرائے گا۔
ممکن ہے مایوس ہو کر، تھک ہار کر سفر ہی ترک کر دیں اس لیے ماہرینِ فن نے
جو اس راہ پر چلتے رہے ہیں اور ان دشواریوں سے واقف ہیں اس راہ پر
جا بجا یہ سنگِ میل نصب کر دیئے تاکہ سالک کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔
اور خوشی خوشی شوق سے سفر کٹے۔ یہ نہ ہوں جب بھی چلتے رہنے والوں کا
سفر تو کٹ ہی جائے گا مگر وہ طمانیت وہ ذوق وہ خوشی کہاں ہو گی
ہاں اگر سالک ان مقامات ان سنگہائے میل میں سے کسی ایک جگہ پہنچ
کر رُک جائے تو یہی سنگِ میل اس کا راستہ روک لے گا۔ SENSE OF PROPORTION الہذا
کا تقاضا یہی ہے کہ نگاہ منزل پر رہے اور یہ سنگہائے میل
حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ تو یہ مقامات یہ تدابیر نہ فرض نہ واجب بلکہ محض
مسافر کا دل بڑھانے کے لیے ایک معاون ہے پھر اس کے ثبوت کی تلاش
کیوں ہو۔

زمین کے سینے پر جو سنگِ میل نصب ہوتے ہیں ان سے یہ مقامات کچھ
مختلف ہیں اِن کے اندر حکمتیں ہیں اور وہ حکمتیں اِنسان کی عملی زندگی کے ساتھ
وابستہ ہیں۔ اہلِ فن نے ان کی نشاندہی کر دی ہے ہر مقام کی الگ خصوصیت
ہے اور ہر مقام پر پہنچنے والے مسافر کی عملی زندگی پر اس مقام کی خصوصیت
کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مجالس میں کچھ
مقامات کی خصوصیات اور عملی زندگی سے ان کے تعلق پر ذرا تفصیل سے
گفتگو کی جائے۔

لطائف

لُطف کے متعلق عملی بحث خاصی طویل ہے۔ یہ کام اہلِ علم کے کرنے کا ہے انہی کے لیے اُٹھا رکھیں، ہماری حیثیت بیمار کی ہے. بیمار جب ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے، تو وہ اسے دوائی دیتا ہے طریقِ استعمال بتا دیتا ہے آپ نے کسی بیمار کو دیکھا کہ ڈاکٹر سے اُلجھنے لگے۔ اعضائے رئیسہ کا عمل کیا ہے۔ یہ دوائی کیوں لوں وہ کیوں نہ لوں۔اس طریقے سے کیوں استعمال کروں۔ خود کوئی طریقہ کیوں نہ تجویز کر لوں۔ بلکہ بیمار تو ہمیشہ اس نیّت سے معالج کے پاس آتا ہے کہ اس کے پاس آنے والے مریض اکثر صحت یاب ہوتے ہیں اس نے خود خواہ طبّ کی کتابیں پڑھی بھی ہوں تو اپنے علم پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ ڈاکٹر کے علم اور تجربے پر اعتماد کرتا ہے یہی طرزِ عمل ہمارا بھی ہونا چاہیئے. مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے جسمِ انسانی میں چند اعضاء ایسے ہیں جنہیں اعضائے رئیسہ کہتے ہیں اگر یہ اعضائے رئیسہ دُرست ہوں اور ٹھیک عمل کرنے لگیں تو پورا جسمانی نظام درست رہتا ہے اس لیے حاذق طبیب ہمیشہ اعضائے رئیسہ کی اصلاح پر خصوصی نگاہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح رُوحانی نظام میں بھی کچھ اعضائے رئیسہ ہیں جنہیں لطائف کہا جاتا ہے۔ رُوحانی معالج اِنہی اعضائے رئیسہ کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں اور جس طرح طبِ یونانی والے شیخ الرئیس یعنی بُو علی سینا کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہیں۔ اسی طرح رُوحانی معالج بھی اس فن کے ماہرین پر اعتماد کرتے ہیں اور صدیوں کا تجربہ شاہد ہے کہ اس طریقِ علاج سے اکثر مریض صحت یاب

ہوتے ہیں۔

ان لطائف میں پہلا لطیفہ قلب ہے اس لیے سب سے پہلے اس لطیفہ کی اصلاح سے یہ سفر شروع ہوتا ہے۔ جسم انسانی پر میل کی تہیں جم جائیں تو مسام بند ہو جاتے ہیں جسم بیمار ہو جاتا ہے، آدمی بدپرہیزی کرے کوئی مضر غذا استعمال کرے تو بیماری آ گھیرتی ہے۔ اسی طرح لطیفہ قلب بھی بیمار ہو جاتا ہے اس کی بدپرہیزی اللہ کی نافرمانی کرتے کرتے اس پر میل کی تہیں جم جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نشاندہی فرمائی ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳ : ۱۴)

"یعنی اللہ کی مسلسل نافرمانی سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے۔"

اسی طرح گندے ماحول، ناقص تعلیم، غلط تربیت سے بھی دل پر میل چڑھ جاتا ہے اور یہ غیر شعوری طور پر بھی ہوتا رہتا ہے جیسے آدمی صاف ستھرا ہو صاف لباس پہن کے کسی گرد و غبار والی جگہ چلا جائے یا کسی ایسے کارخانے میں جائے جہاں دھواں ہی دھواں ہو تو اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود گرد و غبار اور دھوئیں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح خدا بیزار ماحول کی نحوست سے لطیفۂ قلب متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس لیے قلب کا میل اُتارنا ضروری ٹھیرا۔ سوال یہ ہے کہ اس کی تدبیر کیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ کہ

لکل شیئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ

یعنی ہر میلی چیز کا میل دُور کرنے اور اسے جلا دینے کی کوئی تدبیر ہوتی ہے اور دلوں کی میل دُور کرنے اور انہیں چمکانے کا ذریعہ اللہ کا

ذکر ہے۔(البیہقی)

بس یہی تدبیر یہاں اختیار کی ہے اللہ کے پاک نام کی ضربیں لطیفہ قلب پر لگاتے لگاتے میل چھٹ جاتا ہے۔ قلب میں صفائی آ جاتی ہے۔ قلب منور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نشاندہی فرمائی ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۲۲:۳۹)

جب حضورؐ نے یہ آیت سنائی تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کی کوئی نشانی بھی ہے تو حضورؐ نے فرمایا ہاں!

الانابة الى دار الخلود والتجا فی عن دار الغرور والتاهب للموت قبل نزوله

ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف مائل ہونا اور راغب ہونا اور دھوکے کے گھر (دنیا کی لذتوں اور نمائش) سے دور رہنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنا۔ جب قلب کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں قلب جاری ہو گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ سلوک کے پہلے سبق سے ہی انسان کی زندگی میں انقلاب آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ سلوک کا انسان کی عملی زندگی سے کیا تعلق ہے تو قلب جاری ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی سوچ کا رُخ بدل گیا۔ اب اس کے لیے آخرت کی ابدی زندگی کی اہمیت واضح ہو گئی۔ دُنیا کی عارضی اور وقتی لذتوں سے دل سرد ہو گیا۔ اب اس کی فکر ہونے لگی کہ مرنے کے بعد جہاں جانا ہے وہاں کے لیے راحتوں کا سامان اسی زندگی میں تیار کرنا اور جمع کرنا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ تصوّف و سلوک ترکِ دُنیا کی تعلیم نہیں

دیتے بلکہ ترکِ محبّتِ دُنیا کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے کیونکہ محبّت کا تقاضا
ہے کہ آدمی کو محبُوب کے سوا کسی اور کا نہ رہنے دے۔ جب دُنیا
کی محبّت دل میں گھر کر گئی تو اللہ کی محبّت کہاں آئے گی۔ اس لیے
جب سالک کا لطیفۂ قلب راسخ ہو جائے یا یوں کہئے کہ قلب جاری
ہو جائے تو وہ اپنی عملی زندگی کا جائزہ لے کسی کام میں بھی اس کا
مقصُود حصولِ لذّت نہ ہو بلکہ ہر کام میں مقصد رضائے الٰہی ہو کیونکہ
ابدی زندگی کی راحتوں کا مدار اسی پر ہے اور اگر سالک اس کے
بعد بھی دُنیا کی محبّت میں پھنسا رہا۔ جائز و ناجائز میں تمیز نہ کی۔ حلال و
حرام کی پروا نہ کی تو سمجھ لے کہ لطیفۂ قلب منوّر نہیں ہُوا ہاں اتنا ہُوا
کہ بجلی سی کُوند گئی اور پھر اندھیرا گھُپ ہو گیا۔

یوں سمجھئے کہ لطیفۂ قلب کا راسخ ہونا ایسا ہے جیسے سٹیم بھر گئی۔ ذخیرہ
تو ہو گیا مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس سٹیم سے انجن کو بھی چلایا یا نہیں۔ اگر
انجن اسی طرح جام کھڑا ہے اس میں کوئی حرکت نہیں آئی تو سٹیم کے
ذخیرہ کر لینے کی کیا خوشی، اور انجن کا چلنا کیا ہے یہی کہ عملی زندگی میں
اعضائے جسمانی صحیح سمت کو حرکت کرنے لگے۔ کیونکہ قربِ الٰہی کے لیے
عمل درکار ہے اور اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵:۱۰)
میں یہی اشارہ ملتا ہے کہ روح کو قربِ الٰہی کی طرف بڑھانا اعمالِ صالحہ
کا کام ہے تو لطیفۂ قلب کا راسخ ہونا یہی ہے کہ انسان میں عملِ صالح
کی رغبت اور فکر پیدا ہو جائے۔ اور بُرائی جو مرغوب تھی اب اس سے
نفرت ہونے لگے، یہ حالت اسی وقت ہوتی ہے جب ہر حال میں ہر وقت
اور ہر جگہ اس کی توجّہ اللہ کی طرف رہے۔

لوگ کہتے ہیں ہر حال میں اللہ اللہ کرنا ناممکن ہے آدمی کاروبار میں مصروف باتیں کر رہا ہے اللہ اللہ کیسے کرے۔ بظاہر بات تو درست ہے۔ مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ زبان سے اللہ اللہ کرنا اور بات ہے اور دل توجہ ہر وقت اللہ کی طرف رہنا اور بات ہے اور یہ ناممکن نہیں۔ آدمی کاروبار میں مصروف ہے لیکن ہر کام میں اگر اسے خیال رہے کہ یہ کام اللہ کی ہدایت کے مطابق کر رہا ہوں۔ اور اس کام سے اللہ نے منع کیا ہے اسے نہیں کروں گا تو اس میں توجہ الی اللہ کب رکاوٹ بنتی ہے۔ پھر آدمی یہ سوچے یہ کام کرنے کی اہلیت کس نے دی۔ صلاحیت کس نے پیدا کی۔ اعضاء میں یہ قوت کس نے عطا کی یہ ساری نعمتیں اگر اس کی نافرمانی میں لگاؤں تو مجھ جیسا نافرمان کون ہو گا۔

اس یکسوئی اور توجہ کی مثال تو ہر آدمی کے سامنے پیش آتی ہے۔ آپ بس میں سفر کر رہے ہیں آپ نے دیکھا ہو گا۔ ڈرائیور بس چلا رہا ہے باتیں بھی کر رہا ہے۔ سگریٹ سلگا رہا ہے۔ کوئی چیز کھا پی رہا ہے۔ مگر کیا اس کی توجہ کبھی سٹیئرنگ یا سڑک سے ہٹی ہے جب ایک ڈرائیور کی توجہ ہمہ وقت سڑک اور گاڑی کی طرف رہ سکتی ہے تو ایک بندے کی توجہ ہمہ وقت اپنے رَبّ کی طرف کیوں نہیں رہ سکتی۔

لطیفۂ قلب کے راسخ ہونے کا مفہوم تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اس سے اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیجئے اور جو حضرات اس نعمت سے مُستفید ہو چکے ہیں وہ اپنی عبادات اپنے معاملات اور اپنے اخلاق کا جائزہ لیں۔ اور ان پر کڑی نگاہ رکھیں کہ آپ قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے چل کھڑے ہوئے ہیں اور قربِ الٰہی کا مدار اعمالِ صالحہ

پر ہے اور مقاماتِ سلوک عملی زندگی کو چلانے والے انجن کے لیے سٹیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخر میں ایک اللہ کے بندے کے بیان کردہ حقائق پیش کرتا ہوں۔

حضرت رامپوریؒ فرماتے ہیں!

"ان لطائف کے جاری ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ قلب حرکت کرے یا انوار نظر آئیں بلکہ ان کے جاری ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ان کے مفہوم منکشف ہو جائیں مثلاً قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کی طرف خیال رہے دل سے دُنیا اور ہر چیز کی محبت نکل جائے۔ جب یہ حالت ہو تو سمجھے کہ کچھ کام چل پڑا ہے۔"

وما توفیقی الاّ باللہ علیہ توکّلت و الیہ انیب۔

مجلسِ ذکر (۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲۶: ۸۹)

"اور جس روز سب زندہ ہو کر اُٹھیں گے اُس روز مجھے رُسوا نہ کرنا جس دن میں (نجات کے لیے) نہ مال کام آئے نہ اولاد۔ ہاں جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے گا۔

گذشتہ مجلس میں لطیفۂ قلب کا بیان ہو رہا تھا جو آیت میں نے اب تلاوت کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجات کے لیے قلبِ سلیم لے کر اللہ کے سامنے حاضر ہونا شرط ہے۔ قلبِ سلیم اس دل کو کہتے ہیں جو بیمار نہ ہو۔ تمام بیماریوں سے پاک ہو دل کی سب سے بڑی بیماری کفر و شرک ہے۔ اس بیماری کے ہوتے ہوئے نجات ممکن نہیں۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا۔

فی قلوبھم مرض

یعنی ان کے دل بیمار ہیں ظاہر ہے کہ بیماری کفر و شرک ہی ہے مگر دل کی چھوٹی چھوٹی بیماریاں بے شمار ہیں۔ کسی بیماری سے دل پر میل آ جاتا ہے۔ کسی سے دل بسمل ہو جاتا ہے اور کسی سے اَدھ موا ہو جاتا ہے ان بیماریوں کے ہوتے ہوئے نجات تو ہو جائے گی۔ مگر

بھٹی چڑھا کر ان کا اثر زائل کرنے کے بعد شاید ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محض فضل سے ہمیں کفر و شرک کی بیماری سے بچا رکھا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ مگر چھوٹی چھوٹی بیماریاں ہم نے بے شمار جمع کر رکھی ہیں۔ ان بیماریوں سے ہی دل پر میل جم جاتا ہے جس کو اُتارنے کا نسخہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ذکرِ الٰہی تجویز فرمایا ہے ذکرِ الٰہی سے دل کی چھوٹی چھوٹی بیماریاں تو دُور ہو جاتی ہیں اور دل منوّر ہو جاتا ہے۔ صحتمند ہو جاتا ہے مگر صحت حاصل ہو جانے کے بعد بھی بیمار چارپائی سے چمٹا رہے اور کوئی کام نہ کرے تو لوگ اسے معذور سمجھتے ہیں لیکن ایک بھلا چنگا آدمی بس لوتھ کی لوتھ پڑا رہے تو اس کے سوا کیا کہیں گے کہ یہ کام چور ہے۔

اسی طرح اگر لطیفۂ قلب منوّر ہُوا اور آدمی کی عملی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو اس کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ صحت مند تو ہے مگر کام چور ہے ایک نہتا آدمی کسی مسلح دشمن سے مار کھا جائے تو لوگ اسے معذور سمجھتے ہیں۔ لیکن آدمی کے پاس اسلحہ موجود ہو۔ مدافعت کر سکے۔ پھر بھی کچھ نہ کرے تو یہی کہا جائے گا کہ بُزدل ہے۔ اِسی طرح جب قلب منوّر ہو گیا۔ لطیفہ راسخ ہو گیا تو آدمی اپنے ازلی دشمن شیطان کے مقابلے میں مسلح بھی ہے اور دفاع کا بندوبست بھی کامل طور پر موجود ہے پھر بھی شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ بھگوڑا سزا کا مستحق ہے۔ دُشمن تو تیا پانچا کرے گا مگر مالک کی سزا سے بھی بچ نہیں سکتا۔ لہٰذا جو سالک قدرت کی طرف سے اس اسلحہ سے لیس کر دیا گیا اس سے لازماً باز پُرس ہو گی کہ اس نے نعمت کی قدر کیوں نہ کی۔

لطائف کے سلسلے میں ایک بات پڑھنے اور سُننے میں آتی ہے کہ مثلاً جب لطیفۂ قلب کرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں زیرِ قدم حضرت آدم علیہ السّلام تو اس سے کیا مُراد ہوتی ہے۔ اہلِ فن اس کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ اس لطیفہ میں حضوُر اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فیض بالواسطۂ حضرت آدم علیہ السّلام پہنچتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ روشنی تو سُورج سے آتی ہے اگر یہ روشنی براہِ راست پہنچے تو اس کا ایک ہی رنگ ہو گا۔ اور کسی شیشے سے گزر کر آئے تو اس روشنی میں اس شیشے کے رنگ کی جھلک بھی ہو گی۔ اگر وہ سبز رنگ کا شیشہ ہے تو روشنی میں سبزی نمایاں ہو گی۔ اسی طرح زرد سُرخ سُنہری جو رنگ بھی ہو گا۔ اس کا رنگ بھی روشنی کی شعاعوں میں شامل ہو گا۔

اصل فیض تو حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ہے آپ ہی اس کائنات کے لیے شمس تاباں اور سراج منیر ہیں تمام انبیاءؑ سے اپنی اُمتوں کو جو فیض پہنچا وہ اصل میں حضورؐ ہی کا فیض تھا۔ اپنے اپنے دَور میں انبیاءؑ نے اس فیض کے پہنچنے کے لیے واسطہ کا فرض ادا کیا۔

تمام انبیائے کرام اپنے اپنے دَور میں خیر البشر اور انسانِ کامل تھے مگر کوئی ایک بات خصوصیت سے ان کی سیرت مُبارکہ میں ممتاز نظر آتی ہے اسے ان کی خصُوصیات کہیں یا امتیازی پہلو بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے تو زیرِ قدم آدمؑ سے مُراد یہ ہے کہ حضورؐ کے فیض کا وُہ پہلو جو حضرت آدمؑ کی امتیازی خصوصیّت ہے۔ سالک کو اس سے حِصّہ مِلتا ہے گویا سالک ان کے نقشِ قدم پر چلتا ہے یا یوں کہیئے کہ ذکرِ الٰہی سے اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ ان کے

نقشِ قدم پر چلے۔ مگر صلاحیت پیدا ہونے اور عملاً چل پڑنے میں کچھ فاصلہ ہے اب اگر سالک اس صلاحیت کو بروئے کار نہیں لاتا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر نہیں کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے وفائی کی۔

حضرت آدم علیہ السّلام کی سیرتِ طیبہ میں ایک چیز سامنے آتی ہے کہ آپ سے ایک لغزش ہو گئی۔ اور لغزش کرانے والے کا اتا پتا بھی بتا دیا گیا کہ فاز لھما الشیطان عنھا (۳۶:۲) مگر اس کے بعد آپ کو ندامت ہوئی اور اپنے رب سے معافی مانگتے ہوئے عرض کیا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (۷ : ۲۳)

گویا انسانیت کا خاصہ یہی ہے کہ ٹھوکر کھا جائے۔ تو نادم ہو اور معافی مانگے۔ دُوسری طرف ابلیس سے نافرمانی کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگا۔ اَنَا خَیْرٌ مِنْهُ گویا گناہ پر اصرار کرنے لگا۔ اور اکڑنے لگا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ پر اصرار کرنا اور اِترانا بڑی شیطنت ہے۔

لطیفۂ قلب کے منوّر ہونے کا اثر یہ ہونا چاہیئے۔ کہ انسان جو خطا کا پتلا ہے جب ٹھوکر کھا جائے تو فوراً اُسے ندامت کا احساس ہو اور اپنے رب سے گڑگڑا کر معافی مانگے اِس نُورِ قلب کی شان یہ ہے کہ انسان جب ڈگمگانے لگے۔ تو پہلے ہی یہ نور اس کو غلطی سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور صحیح راستہ کی نشاندہی کر دیتا ہے اور اگر پھر بھی لغزش ہو ہی جائے تو یہ نور اسے ندامت کا احساس دلاتا ہے اور استغفار پہ آمادہ کرتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہُوا تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ نادان انسان نے آگے بڑھ کر اس چراغِ ہدایت کو خود گُل کر دیا اس لیے سالک کو ہمیشہ اپنی عملی زندگی

کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیئے :

احتیاط اور احتیاط ذرا
بجھ نہ جائے یہ آگہی کا چراغ.

لطیفۂ رُوح

جسمِ انسانی میں دل کا فعل دُرست ہو جائے تو صاف خُون وریدوں اور شریانوں میں گردش کرنے لگتا ہے اور باقی اعضائے رئیسہ پر بھی اس کا خوشگوار اثر ہوتا ہے گویا دل کی درستی بالواسطہ تمام اعضائے رئیسہ کی اصلاح کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح جب سالک کا لطیفۂ قلب منور ہو جائے باقی لطائف بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ فرمایا

ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا
فسدت فسد الجسد کله الا و هی القلب او کما قال۔

قلب جاری ہونے کا مفہوم کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی چشمہ سے پانی جاری ہو جائے تو اس سے یہی مُراد ہوتی ہے پانی چشمہ سے نکل کر ڈھلوان کی طرف بہنا شروع ہو گیا۔ یہی پانی ندی نالے دریا بنتا ہُوا بالآخر سمندر میں پہنچ جاتا ہے جو اس کی آخری منزل ہے اسی طرح قلب جاری ہُوا تو اس کے انوار اور اس کی آب و تاب نے باقی لطائف کو متاثر کیا اور سالک کی رُوح اپنی منزل یعنی قربِ الٰہی کی طرف پرواز کرنے لگی۔ لطیفۂ قلب کے جاری ہونے سے اس کا ہمسایہ دوسرا لطیفہ جسے رُوح کہتے ہیں لازماً متاثر ہُوا۔ شیخ نے توجہ سے دوسرے

لطیفہ کی تربیت شروع کر دی اور سالک دوسرے لطیفے کو منوّر کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اہلِ فن اس لطیفہ کی تربیت کے وقت کہتے ہیں۔ زیرِ قدم حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ ہے۔اس لطیفہ کے جاری اور راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا فیض ان دو اولوالعزم پیغمبروں کے توسط سے سالک کو پہنچ رہا ہے۔ ان حضرات کی سیرت میں چند خصوصی پہلو ممتاز نظر آتے ہیں۔

حضرت نوحؑ کی سعیِ مسلسل کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ۹۵۰ برس تک اپنی قوم کو دعوت الی اللہ دیتے رہے نہ تھکے نہ اکتائے نہ دعوت کا کام بند کیا۔ ظاہر ہے کہ بڑی کامیابی ہوئی ہو گی۔ کثیر التعداد لوگوں نے دعوت کو قبول کیا ہو گا۔ یہ بہار دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہوں گے اس لیے دعوت کا کام چھوڑ دینے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے مگر حالات اس کے برعکس تھے۔ ۹۵۰ برس کے عرصہ میں صرف اِتنے انسانوں نے ان کی بات پر کان دھرا جو ایک کشتی میں آ گئے۔ اندازہ کیجئے وہ کتنے ہوں گے۔ ایک سو سے زیادہ کیا ہو سکتے ہیں اگر یہی تعداد فرض کر لی جائے تو ۹ آدمی فی سو سال کے قریب بیٹھے۔ غور کیجئے اللہ کا جلیل القدر پیغمبر سال بھر محنت کرتا ہے اور محنت بھی کیسی کہ اِنِّی دَعَوْتُ قَوْمِی لَیْلاً وَ نَھَارًا[(۷۱:۵)]۔ کہ رات دن دعوت دیتا رہا نتیجہ کیا سامنے آتا ہے فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَائِیْ اِلَّا فِرَارًا[(۷۱:۶)]۔ کہ مَیں جتنا بُلاتا ہُوں وہ اتنا دُور بھاگتے ہیں۔ مَیں جتنا کھینچتا ہوں وہ اتنے بدکتے ہیں جیسے طبعیات والے کہتے ہیں کہ ANTI-MAGNETIC SUBSTANCE کو مقناطیس

بنانے کی جتنی کوشش کی جائے گی اس کا اثر اُلٹا ہی ہوتا ہے۔ اس المیہ کے باوجود حضرت نوحؑ نے دعوت و تبلیغ کا کام ترک نہیں کیا۔ آخر جب اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے معلوم کر لیا کہ یہ زمین بالکل بنجر ہے اور سانپ کے ہمیشہ سپولیے ہی پیدا ہوتے ہیں یہ جتنے بڑھیں گے زہر زیادہ پھیلے گا۔ تو دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۱) ‎(۷۱ : ۲۶، ۲۷)

یعنی الٰہی ان ظالموں کا نام و نشان تک نہ رہنے دے یہ خود جب تک جیئے بغاوت ہی پھیلائیں گے اور ان سانپوں کے بچے بھی زہرلے کر پیدا ہوں گے اور تیری مخلوق کو ڈستے پھریں گے۔

اس سے سالک کو دو امور کی رہنمائی ملتی ہے اوّل یہ کہ جو دولت اسے ملی ہے اسے بانٹے مخلوق کو دعوتِ الی اللہ دے اور اس کام کو کوئی طاقت اور کوئی ناخوشگوار حالت روک نہ سکے۔ یہاں آدمی ایک غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی کوشش کا خاص نتیجہ پہلے ہی تصوّر میں رکھ لیتا ہے کہ میری دعوت یوں قبول ہو گی۔ اتنے لوگ قبول کریں گے وغیرہ جب نتیجہ اس کے اندازے کے مطابق ظاہر نہیں ہوتا تو حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور کام چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بڑا خطرناک موڑ ہے۔ اس پریشانی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی معاذ اللہ خدا بننا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو۔ اور یہ منصب صرف خدا کو سزاوار کہ جو وہ چاہے وہی ہو۔ بندہ کا مقام یہ ہے کہ اپنی ڈیوٹی کرتا رہے نتیجہ اس کے حوالے کرے جو یہ سارا نظام چلا رہا

ہے اور ہمیشہ یہ خیال رہے کہ نتیجہ وہی ہو گا جو وہ چاہے گا۔ آدمی جب اپنے دائرہ عمل سے نکل کر خدا کے دائرہ کار میں قدم رکھتا ہے تو اُسے پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا سالک کا کام یہ ہے کہ نتیجہ سے بے نیاز ہو کر دعوتِ الی اللہ کا کام کرتا چلا جائے۔ ترکِ دعوت کا خیال بھی نہ آنے پائے۔ نتیجہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاءؑ کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے توسط سے امت کو یہی تعلیم دی ہے کہ

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۳:۲۶)

یعنی آپ اس فکر میں کیوں گھلے جا رہے ہیں۔ کہ یہ لوگ آپ کی بات کیوں نہیں مانتے پھر ہدایت و ضلالت کا راز بتاتے ہوئے فرمایا۔

(۵۶:۲۸)

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ

یعنی ہدایت دینا آپ کے دائرہ عمل سے باہر ہے اس کا تعلق میری ذات سے ہے آپ کا کام بس دعوت دیتے چلے جانا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سالک کو یہ دیکھ کر کہ حضرت نوحؑ نے آخر تنگ آ کر باغیوں کو تباہ کرنے کی درخواست کر ہی دی۔ یہ سوچنا چاہیئے۔ یہ معاملہ ایک اولوالعزم پیغمبر کا ہے جسے رب العالمین سے براہِ راست حقائق منکشف ہوتے ہیں نبی خود نہیں کہتا بلکہ اس سے کہلوایا جاتا ہے۔ یہ منصب کسی غیر نبی کو حاصل نہیں جیسے آیت أأنذرتهم ام لم تنذرهم لا یؤمنون کے نزول سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو

آگاہ کر دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے آپ خواہ کتنی کوشش کر دیکھیں۔ علماء کہتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کو کچھ نہیں کہا اس سے پہلے آپؐ دیکھتے تھے۔آپؐ کی دعوت کا اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا مگر برابر دعوت دیتے رہتے تھے۔ اس لیے سالک کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ منصب صرف نبی کا ہے۔ افراد اُمّت کا کام یہ ہے کہ برابر دعوت الی اللہ دیتے ہی رہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب دعوت کے جواب میں انکار، ضد یا جھگڑے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو حکمتِ تبلیغ کو مدِنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔جو داعیِ حق حکمتِ تبلیغ سے کام نہیں لیتے وہ نہ صرف خود مایوس ہوکر اپنا کام بگاڑتے ہیں بلکہ مخاطب کے اندر ضد اور ہٹ دھرمی کے جذبات کی پرورش کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے سالک کو اس خطرے سے آگاہ رہنا چاہیئے۔حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ داعی اپنے مخاطب کو مریض سمجھے بغیر سوچے کہ ایک معالج جسے صرف مریض کی خیرخواہی مطلوب ہو علاج کے دوران مریض سے کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔بس وہی طرزِ عمل اختیار کرنا مناسب ہوتا ہے۔جھگڑا، مناظرہ یا فتویٰ سے دعوت وتبلیغ کا کام نہیں ہو سکتا۔

ایک مثال پیش کرتا ہوں فرض کیجئے آپ سے مُطالبہ ہوتا ہے کہ فلاں جگہ بیان کرنا ہے ذکر کی فضیلت بتانی ہے اور ذکر کرانا ہے کیونکہ وہاں ایک آدمی ہماری مخالفت پر تُلا ہوا ہے اور وہ مجلسِ ذکر کے خلاف تحریک چلانا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ اس مُطالبے کے اندر خود ضد اور مخالفت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مطالبہ پُورا ہی کرنا ہو تو

صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی بات پوری دلسوزی سے کہہ دے پھر دعوت دے کہ بھئی مجھے یہ کام مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے آپ گھر جا کر اس پر غور کریں اگر آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں تو بسم اللہ کر دیجئے اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ یہ کام غیر مفید یا غیر ضروری ہے تو اس بات کو بھول جائیں کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ اور اس نے کوئی بات کہی تھی۔ اِس طرح کا ایک تجربہ ہوا ہے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ وہ جسے ہم مخالف سمجھے تھے وہ برابر بیٹھا بات سُنتا رہا اور وقتاً فوقتاً اسے آبدیدہ ہوتے بھی دیکھا پھر بیان کے بعد مجلسِ ذکر ہوئی تو وہ ذکر میں بھی شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ ایک پَل میں دِل پھیر دیتا ہے اِس لیے دعوت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اللہ سے دُعا کرتے رہنا چاہیئے کہ میری باتوں سے کچھ نہیں ہو گا۔ بس تُو اپنی قدرت سے دلوں کو اپنی طرف پھیر دے۔

حضرت نوحؑ کے ساتھ دوسرا نام حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا آتا ہے آپ کی سیرت کا ایک ایک پہلو رہتی دُنیا تک انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ مگر کچھ نقوش ایسے بھی ہیں۔ جو زیادہ اُبھرے ہُوئے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک امر کی نشاندہی کرتے ہوئے ارشادِ باری ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ۔ (۶۰ : ۴)

"تم کو چال چلنی چاہیئے ابراہیمؑ کی اور جو اس کے ساتھ تھے جب انہوں نے کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے اور ان

سے کہ جن کو پوجتے ہو اللہ کے سوا۔ ہم منکر ہوئے تم سے
اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو۔یہاں
تک کہ تم یقین لاؤ اللہ واحد پر۔"

حضرت ابراہیمؑ نے دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تو گھر سے
مخالفت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باپ مخالف ہوگیا۔ برادری نے تنگ کرنا
شروع کیا۔ قوم سر ہوگئی مگر آپ کے پائے استقلال کو ذرا لغزش نہ
آئی۔ برابر دعوت کا کام کرتے رہے رہا اللہ کے باغیوں سے برتاؤ کا
معاملہ تو آپ نے اعلان کر دیا کہ میں تمہارے عقائد سے تمہارے اعمال
سے بیزار ہوں۔ رشتہ اور دوستی کے تعلقات ختم ہوئے۔اس اعلانِ بیزاری
کے باوجود ان کے لیے خیرخواہی کا جذبہ موجود رہا۔کہ میں اپنے ربّ سے
درخواست کروں گا۔کہ میرے باپ کو ایمان کی دولت عطا فرما کر اس
کے گناہ معاف کر دے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ الی اللہ میں
یہ حالات بھی سامنے آتے ہیں اپنے بھی بیگانے بن جاتے ہیں مگر اِس
صورتِ حال سے گھبرا کر کام نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو چھوڑ دیتا ہے مگر
اعلان برأت۔بیزاری اور دشمنی ان کی ذات سے نہیں بلکہ ان کے عقیدہ
اور عمل سے ہے اگر وہ اپنے آپ کو بدل دیں تو اعلانِ بیزاری اپنے
آپ ختم ہُوا۔ اس بائیکاٹ کے ساتھ ہی ان کے حق میں دُعا کا سلسلہ
جاری رہے کیونکہ اُن کی خیرخواہی کا تقاضا یہی ہے۔

اس قسم کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔میرے سامنے چند نوجوان
موجُود ہیں۔جن کو گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی گئی۔ انہیں کہا گیا کہ تم نے
تو خاندان کی ناک کٹوا دی۔ تم نے اپنے کنبے کو بدنام کر دیا۔تم نے اپنی

شکل بگاڑ لی۔ تم میستل کہلانے لگے وغیرہ، ایسی مثالیں عام ہیں اور ایسے حالات اکثر سُننے اور دیکھنے میں آتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خُدا بیزاری اور دین سے دُوری کی وبا، عام ہو گئی ہے۔ بے راہ روی کے جراثیم نے انسان کو اس بُری طرح متاثر کیا ہے کہ بڑے بوڑھے بھی اس کی پیپٹ میں آچکے ہیں۔ ہم نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب کوئی بچّہ، کوئی جوان کوئی غلط روش اختیار کرتا تھا تو والدین اور خاندان کے دوسرے بُزرگ پریشان ہونے لگتے۔ اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ آج یہ حالات بھی دیکھ رہے ہیں کہ اگر کوئی بگڑا ہوُا جوان دین کا رُخ کرتا ہے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو بوڑھوں اور بزرگوں کی دُنیا میں زلزلہ آجاتا ہے اور اپنی بڑائی اور بُزرگی کے بل بوتے پر جوانوں کی راہ روکنے کے لیے میدان میں نکل آتے ہیں اس لیے ان حالات میں تو زیادہ مستعدی زیادہ محنت و ہمت اور کوشش کی ضرورت ہے ہم نے اپنی فکر نہ کی تو خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہماری جگہ وہ کسی اور قوم کو اس کام پر مقرر کر دے گا۔ اس کا دین تو بہرحال قائم رہنا ہے۔ ہم نہیں اور سہی۔

ان کا کیا ہے چاہنے والے تم نہ سہی تو اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو تم تنہا رہ جاؤ گے

اس راہ میں رکاوٹیں پیش آنا کوئی انوکھی بات نہیں یہ ایک فطری عمل ہے۔ رکاوٹیں یقیناً قلب کو اور جوشِ عمل کو متاثر کرتی ہیں۔ ایک عام آدمی کے لیے رکاوٹ کی وجہ سے عمل میں کچھ کمی آجانا بھی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہر شخص میں اس درجے کی قوّتِ ارادی نہیں ہوتی جو

حضرت ابراہیمؑ کو اللہ پاک نے عطا کی تھی۔ مگر بالکل رُک جانا اور چھوڑ بیٹھنا محبت کی توہین ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ پاور ہاؤس سے جس طاقت کی بجلی کی رو چلتی ہے۔ صارفین کے ہاں اتنی طاقت کی کرنٹ نہیں پہنچتی بلکہ اہلِ فن نے اس کا ایک فارمولا معلوم کیا ہے کہ ایکٹرو موٹو فورس کو ٹوٹل ریزِسٹینس پر تقسیم کرتے ہیں جو حاصل قسمت ہوتا ہے۔ اس قوت کی کرنٹ آگے پہنچتی ہے معلوم ہُوا کہ ریزِسٹینس یا رکاوٹ سے زور تو کم ہو سکتا ہے مگر کرنٹ ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ تو بے جان بجلی کے کرنٹ کی حالت ہے ایک جیتا جاگتا اِنسان ایک مُسلّح سالک اگر رکاوٹوں کی وجہ سے کام ہی چھوڑ بیٹھے تو کتنے شرم کی بات ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی قربانیوں کا اجمالی تصور بھی انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے باپ کو چھوڑا۔ رشتے دار چھوڑے۔ گھر بار چھوڑا۔ مگر امتحان کا سلسلہ ختم نہ ہُوا۔ بڑھاپے میں بیٹا عطا ہُوا تو حکم ہُوا کہ اس بچے اور اس کی والدہ کو ایک غیر آباد سنگلاخ زمین میں چھوڑ آ۔ آپ انہیں لے جاتے ہیں وادی غیرِ ذی ذرع میں چھوڑ کے لوٹنے لگتے ہیں تو بیوی پوچھتی ہے ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہو اتنا کہتے ہیں کہ اللہ کے حوالے اور واپس چل پڑتے ہیں، بیوی، عورت ذات مگر پورے اطمینان سے کہتی ہے کہ اچھا اگر یہ بات ہے تو کوئی فکر نہیں ہمارا اللہ ہمیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔ طبعیات والے جو کہتے ہیں کہ انڈکشن کے اصول کے تحت مقناطیس کا عمل ہوتا ہے۔ یعنی کسی ٹکڑے کو مقناطیس کے ٹکڑے کے پاس رکھ دو کچھ عرصہ پاس پڑا رہنے سے وہ بھی مقناطیس بن جائے گا۔ واقعی وہ لوگ سچ کہتے ہیں۔ بیوی جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس رہی تو اس کے اندر بھی توکّل علی اللہ

اس درجے کی پیدا ہو گئی کہ جنگل بیابان میں بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔ اسے اپنے رب پر اتنا بھروسہ ہے کہ مطلق پریشان نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے غرض یہ ہے کہ سالک کو یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیئے کہ لطیفۂ رُوح کے منوّر ہونے اور راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عملی زندگی میں اس کی سیرت و کردار سے یہ ظاہر ہو کہ واقعی یہ شخص ان دو اُولوالعزم پیغمبروں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس میں دعوتِ دین کا جذبہ موجود رہے۔ توکّل علی اللہ پیدا ہو جائے۔ اسباب ضرور اختیار کرے مگر نگاہ مسبب الاسباب پر جمی رہے آپ کی ذمّہ داری دوگونہ ہے۔ ایک تو اس حاصل شدہ دولت کو محفوظ رکھنا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ موجودہ ماحول میں یہ کام بھی کچھ کم مشکل نہیں بقولِ اکبر الہ آبادیؒ

ہمیشہ پیشِ نظر ہیں وضوشکن منظر
اس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی

یہ دَور نمائش کا دَور ہے ہر کام میں ہر بات میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ کہیں شو (SHOW) میں کمی نہ آ جائے اس لیے اس ماحول کی جاذبیت انسان کو راہِ حق سے قدم قدم پر ہٹانے کی کوشش کرتی ہے ملازم ہے تو رشوت کی کشش اور جاذبیت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، مزدُور ہے تو کام چوری کا لالچ راہ روکتا ہے، تاجر اور کارخانہ دار ہے تو ملاوٹ، دھوکا، ہیرا پھیری میں نفع کی اُمید راہِ حق پہ قائم نہیں رہنے دیتی۔ اگر سالک میں توکّل علی اللہ کا وصف پیدا ہو گیا ہے تو یہ ایک ہتھیار ان سب جاذبیتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

دُوسری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی حفاظت، پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ آس پاس ڈوبنے والوں کو بچانے کی فکر بھی رہے۔ اور اس کٹھن راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا مقابلہ کرتا چلا جائے۔ سیرۃ نوحؑ اور اسوہؑ ابراہیمؑ اس کے لیے مشعلِ راہ ہو اور ہر حالت میں مسبب الاسباب پر نگاہ ہو۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ہدایت پر قائم رکھے۔ اور اسلام اور تمام اہلِ اسلام کی حفاظت فرمائے۔ اٰمین۔

تیسرا لطیفہ

دو لطائف کا بیان ہو چکا ہے۔ تیسرا لطیفہ "سری" کہلاتا ہے اس لطیفہ کی تربیت کے وقت کہا جاتا ہے کہ زیرِ قدم حضرت موسیٰؑ اس کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فیض بواسطہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام پہنچتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی سیرت میں چند باتیں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم ہوتا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی۔ (۷۹ : ۱۷)

کہ وقت کے جابر ترین حکمران کے پاس جائیں وہ بندہ ہو کر خدا بن بیٹھا ہے۔ اور جا کر کریں کیا ؟

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا (۲۰ : ۴۴)

اسے نہایت نرمی سے سمجھائیں کہ اپنے مقام کو پہچانے اور رب کے ساتھ معاملہ کھرا رکھے۔ حضرت موسیٰؑ جیسا جلالی طبیعت کا رسُول اور فرعون جیسا سرکش حکمران اور حکم ہوتا ہے نرمی سے بات کریں وہ کیوں فرمایا ؟

لَعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی۔ (۲۰ : ۴۴)

تاکہ وہ اپنے مقام پر پلٹ آئے یا اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہو جائے اور اس کے وبال کے ڈر سے راہِ راست پر آ جائے۔

سوچیئے یہ کتنا مشکل کام ہے۔ صورتِ حالات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پرورش اسی کے گھر میں ہوئی۔ ایک دُنیادار تو یہی کہے گا۔ کہ مَیں اپنے محسن اپنے مربّی کو کیوں ناراض کروں پھر مَیں اس قوم کا فرد ہوں جو اس کی قلمرو میں نہایت بے بسی اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اتنی بے بس اور مجبُور قوم کہ اس نے اس قوم کے ہزار ہا معصوم اور بے گناہ بچے ذبح کرا دیئے اور اُف تک کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر اللہ کے رسُول کا منصب ہی اور ہے اس کی سوچ ہی مختلف ہوتی ہے۔ اس کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی کہ اس کے احسان کا بدلہ چکانے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے اللہ کے غضب سے اور اللہ کے عذاب سے بچانے کی فکر کی جائے۔

پھر یہ بات کہ ایسے سرکش حکمران سے وہ بات کہنے جا رہے ہیں جسے سُننے کی اسے تاب نہیں۔ جس کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ مگر پاس نہ اسلحہ ہے نہ کوئی اور مادی طاقت، صرف ایک بھائی کو لے کر نہتے جا رہے ہیں۔ مگر کیوں؟ صرف اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے اور بندے کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔

خیر جاتے ہیں۔ دعوت دیتے ہیں۔ جوابی گفتگو کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے جس کی توقع ہو سکتی ہے وہ اپنا احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے۔

اَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَ لَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ (۲۶ : ۱۸)

یعنی کیا تم وہی نہیں ہو جسے ہم نے پالا پوسا اور ہمارے گھر میں اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ گزارا، اب تم کیسے میرے مُنہ آتے ہو۔

دوسرا طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔ (۲۶ : ۱۹)

یعنی پھر تو نے میرے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک قتل کا ارتکاب کیا۔ پھر تم بھاگ گئے۔ یہ تو کھُلی بغاوت ہے۔ یعنی فرعون نے آپ کی بات کو بے وزن بنانے کے لیے دو حربے استعمال کئے اوّل اپنا احسان جتایا دوم سزا سے ڈرایا۔ ایک تو جذبہ شکر گزاری کو اُبھارنے کی کوشش دوسرا ان کے دل میں سزا کا خوف پیدا کرکے بات کو ٹالنا چاہا۔ آپ نے اپنی بات آگے بڑھانے سے پہلے اس کے دونوں طعنوں کا جواب دیا مگر ترتیب بدل دی دوسرے اعتراض کا جواب پہلے دیا۔ اور فرمایا کہ میرے ہاتھ سے ایک آدمی کے اچانک مرجانے کا حادثہ اس وقت پیش آیا جب مجھے اپنے منصب سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ روشنی مجھے

نہیں سونپی گئی تھی۔ رہا احسان کا معاملہ تو واقعی تیرا احسان یہی کیا کم ہے کہ تُو نے میری قوم کو خدا کی پرستش سے ہٹا کر اپنی پرستش کرانے میں لگا رکھا ہے۔

اس پر فرعون نے بات کا رُخ بدلا۔ اور پوچھا اچھا بتاؤ تو تم کونسے رب کی طرف دعوت دیتے ہو۔ آپ نے اپنے رب کی صفات کا تعارف کرایا اب اس نے ایک اور چال چلی جو خالص سیاسی چال ہے کہ عوام کے جذبات سے کام لیا جائے۔ جسے سیاسی زبان میں ایکسپلائٹ کرنا کہتے ہیں کہ اچھا اگر ہدایت اسی کا نام ہے تو آباؤ اجداد کس کھاتے میں شمار ہوں گے ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں کہ وہ گمراہ مرے تو لازماً پبلک ان کے خلاف ہو جائے گی۔ مگر تبلیغ کا پیغمبرانہ طریقہ بھی کیا خوب ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ بات ہماری سوچ کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اسے نہ تو حقائق سے متعلق تاریکی میں رکھا جا سکتا ہے نہ اس سے کوئی چُوک ہوتی ہے۔

اس مکالمہ سے معلوم ہُوا کہ طریقِ موسوی یہ ہے کہ سالک دعوتِ الی اللہ کے کام میں اس خلوص سے لگ جائے کہ نہ تو کسی کا منصب اس میں رکاوٹ بن سکے۔ نہ کوئی لالچ اور ڈر اور یہ نکتہ ملا کہ راہ میں طعنے سُننے پڑتے ہیں۔ لوگ پھبتیاں کستے ہیں مگر سالک کو اپنے کام سے غرض ہونی چاہیئے۔ نیز دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں حکمتِ تبلیغ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر مخاطب مشتعل ہو جائے تو ممکن ہے کہ دلائل کے میدان میں وہ ہار جائے مگر اس سے اس کے اندر جو ضد کی کیفیت پیدا ہو گی

س کا کوئی علاج نہیں۔

داعی کو عموماً تین قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اوّل وہ جو پوری دیانتداری سے بات سمجھنا چاہتے ہیں ان سے بات کرتے ہوئے دلسوزی سے خیرخواہی کے جذبے کے ساتھ خطاب کرنا چاہیئے۔

دوسرے وہ لوگ جو محض ذہنی کُشتی کے طور پر دلیل بازی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ گفتگو مدلّل تو ہونی چاہیئے مگر مقصد یہ ہو کہ بات واضح ہو جائے یہ نہ ہو کہ میری بات رہ جائے۔ اور مخاطب زِچ ہو جائے۔

تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو صرف کج بحثی میں اپنی مہارت دکھانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اُلجھنا بے فائدہ ہے۔ ان سے صاف کہہ دو ہماری سمجھ میں یہ بات یوں ہے تمہیں پسند ہو تو قبول کر لو ناپسند ہو تو چھوڑ دو۔

اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (۱۰ : ۴۱)

حضرت موسیٰؑ کی دوسری مشکل یہ تھی جن لوگوں کو مدّتوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ ان کی تربیت کی اِنہیں کمال تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا خود وہی لوگ قدم قدم پر ان کے پروگرام میں روڑے اٹکانے لگے مثلاً جب حضرت موسیٰؑ اُنہیں مصر سے نکال کر لا رہے تھے۔ اور فرعون کی فوج نے ان کا تعاقب کیا تو لگے طعنے دینے۔

قَالُوۡۤا اُوۡذِیۡنَا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَاۡتِیَنَا وَمِنۡۢ بَعۡدِ مَا جِئۡتَنَا۔ (۱۲۹:۷)

کہ اے موسیٰؑ تیرے اس اقدام سے پہلے بھی ہم ظلم کی چکی میں پستے رہے اور تیرے اس اقدام کے بعد بھی خطرہ ٹلتا نظر نہیں آتا۔ نہ آرام کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ پہلے ہم کسی نہ کسی طرح دن تو گزار رہے تھے اب تو معلوم ہوتا ہے تُو ہمیں غرقِ دریا کر کے چھوڑے گا، حضرت موسیٰؑ

کی جلالی طبیعت اور قوم کی طرف سے احسان فراموشی کا یہ مظاہرہ! مگر انہیں تسلی دیتے ہی رہے۔

پھر جو ایک بُت پرست قوم پر گزر ہُوا تو لگے مطالبہ کرنے۔
اِجْعَلْ لَنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷ : ۱۳۸)
کہ موسیٰؑ دیکھو ان لوگوں کے کیسے من موہنے معبود ہیں۔ ہمیں بھی کوئی ایک تو ایسا دلفریب معبود بنا دے۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کی اس بیہودگی کو برداشت کیا اور ان پر حقیقت واضح کرنے لگے۔

پھر جو دورانِ سفر پکا پکایا کھانا ملنے لگا۔ تو کہنے لگے کہ ہم تو ایک ہی قسم کا کھانا کھا کھا کر اُکتا گئے ہیں۔ اپنے رب سے دُعا کر کہ ہمارے لیے زمین سے رنگا رنگ کی سبزیاں اُگا دے۔ کوئی دال ہو، پیاز ہو، تھوم ہو۔ تبدیلیٔ ذائقہ بھی ضروری ہے۔ زبان کا چٹخارہ بھی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر ان کی حماقت واضح کی مگر ان کے مطالبہ کے پورا کرنے کی صورت بھی پیدا کر دی۔

پھر کہنے لگے کہ ہم تو اس جنگل میں پیاس سے مرے جا رہے ہیں۔ ہمارے لیے پانی کا انتظام کر۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پتھر پر عصا مارا۔ مگر اپنی قوم کی ذہنیت بھی جانتے تھے۔ اس لیے دُعا بھی کچھ ایسی کی ہو گی چنانچہ بارہ چشمے پھُوٹ پڑے، تاکہ بارہ قبیلے ایک ایک چشمے سے سیراب ہوں ایسا نہ ہو کہ پھر ضد میں آ کر کہہ دیں کہ ہم اس چشمے سے پانی نہیں پیتے جس سے فلاں قبیلہ سیراب ہوتا ہے۔

پھر جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے طور پر گئے تو ان کی غیر حاضری میں ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی یوں لگتا ہے جیسے حضرت کا پیمانۂ صبر

بریز ہو چکا تھا۔ اور یہ نہ دیکھ سکے کہ ان ظالموں نے عملاً توحید کے عقیدے پر حلہ بول دیا، چنانچہ اس موقع پر آپ جلال میں آ گئے۔

پھر جب آپ نے فرمایا کہ اس بستی پر حملہ کرو۔ کہ وہاں کے حکام نے بے بس عوام پر ظلم ڈھا رکھا ہے۔ خدا کی مخلوق کو پنجۂ استبداد سے رہا کرانا ہے اس پر تو قوم نے انتہا ہی کر دی۔ جواب دیا کہ موسیٰؑ تُو اور تیرا رب جا کر جنگ کرے۔ ہم تو یہاں سے نہیں ہلنے کے

اس قسم کے کئی اور واقعات ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم کے ہاتھوں دُکھ سہنے پڑے۔ ان سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ سالک کو اپنے ساتھیوں کی طرف سے جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو مقدور بھر ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر کچھ نہ بن پڑے تو نتیجہ اللہ کے سپُرد کرنا چاہیئے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس موقع پر اللہ سے یہی دُعا کی تھی۔

فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِيْنَ۔ (۵: ۲۵)

مگر یہ پیغمبر ہی کا منصب ہے جسے حقائق سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ دُوسرے لوگوں کا کام یہ ہے کہ ایسے موقع پر اللہ سے یہی دُعا کریں کہ اللہ تو قادر ہے تو کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔

دعوت و تبلیغ کا کام مشکل بھی ہے اور نازک بھی اسی لئے آپ کو مشکلات بھی پیش آئیں گی اور لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں مثلاً ایک صاحب سے کسی نے ایک بات پوچھی اس نے کہا یہ ناجائز ہے بس معاملہ بگڑ گیا۔ اگر کوئی عالم ہوتا، بات سلجھا لیتا دلائل سے بات کرتا مگر وہ صاحب چونکہ عالم نہ تھے مگر فتویٰ دے مارا۔ اس لئے علماء تو سمجھتے ہیں کہ کسی عقدہ کا حل کس طریقے سے کیا جائے۔ ہم لوگ جو عامی

ہیں ان کے لیے مَیں یہ کہا کرتا ہوں کہ آپ صرف چار باتوں کی دعوت دیا کریں۔

۱۔ فرائض کی پابندی کیا کرو۔ بالخصوص نماز باجماعت کی۔
۲۔ ہر وقت اللہ کو یاد کیا کرو بالخصوص صبح و شام اہتمام سے
۳۔ حرام سے پرہیز کرو۔
۴۔ جھُوٹ سے بچو۔

اس کے علاوہ کوئی بات پوچھی جائے تو کہہ دو کہ مَیں عالم نہیں ہوں جس عالم پر آپ کو اعتماد ہے اسی سے پوچھ لیں جو وہ کہے وہی کریں۔

آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔ مَیں اسے لطیفہ اس لیے کہتا ہوں کہ بات سادہ ہی ہے مگر ہے دلچسپ ورنہ معروف معنوں میں یہ لطیفہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے پُوچھا کہ اذان سُن کر انگوٹھے چُومنا کیسا ہے؟ مَیں نے پُوچھا اس کی ضرورت کیوں پیش آئی اگر آپ چُومتے ہیں تو کس سے پوچھ کر چُومنا شروع کیا اور اب اس کی بات سے اعتماد کیوں اُٹھ گیا۔ اور اگر نہیں چُوما کرتے تو کس عالم سے پوچھ کر یہ روش اختیار کی۔ اور اب تردّد کیوں پیدا ہو گیا۔ کہنے لگے کہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ چُومتے ہیں کچھ نہیں چُومتے۔ مَیں نے کہا آپ نے صحیح دیکھا ہے۔ کہنے لگے یہ بتائیے کہ جو لوگ چُومتے ہیں وہ کیوں؟ مَیں نے کہا محبّت سے چُومتے ہیں کہنے لگے جو لوگ نہیں چُومتے کیوں نہیں چُومتے؟ مَیں نے کہا محبّت سے نہیں چُومتے۔ کہنے لگے دونوں محبّت سے ایسا کرتے ہیں تو فرق اختلاف کیوں ہے۔ مَیں نے کہا اِس

کی وجہ یہ ہے کہ آدمی مختلف طبیعت کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سمجھتے ہیں کہ جس نے محبت کرنے کا حکم دیا اُس نے محبت کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ اس لیے اظہارِ محبت کا طریقہ محبوب ہی سے پُوچھنا چاہیئے۔ کچھ لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ محبت کا حکم ہے مگر محبّت کا سلیقہ اور محبت کے اظہار کا طریقہ اپنے من سے پُوچھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ محبوب کی بات اور اپنے من کی بات ایک جیسی ہونا ضروری نہیں اس لیے اظہارِ محبت میں مختلف صُورتیں دیکھنے میں آتی ہیں اب یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ اسے اپنے محبُوب کی بات پیاری ہے یا اپنے من کی بات زیادہ پسند ہے۔ کہنے لگے بات سمجھ میں آ گئی۔ مَیں نے کہا اللہ کا شکر ہے دین کی سمجھ عطا کرنا اس کی رحمت ہے۔ اور اس پر چلنا اسی کی توفیق سے نصیب ہوتا ہے۔

چوتھا لطیفہ

راہِ سلوک میں چوتھے سبق کا عنوان ہے "لطیفۂ خفی" اس لطیفہ کی تعلیم کے وقت کہا جاتا ہے۔ زیرِ قدم حضرت عیسےٰ علیہ السلام جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس لطیفہ کے دوران حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فیض سالک کے باطن پر حضرت عیسےٰؑ کے توسّط سے پہنچتا ہے۔

حضرت عیسےٰؑ اپنی بعثت کے بعد مختصر عرصہ کے لیے قوم کے درمیان رہے۔ اس عرصے میں آپ کو دو قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ اوّل دشمن اور مخالف۔ دوم عقیدت مند اور اتباع کا دعویٰ کرنے والے مگر آپ نے اِن دونوں کے ہاتھوں بڑے دُکھ اُٹھائے۔

سب سے پہلے دُشمنوں نے آپ کی ذات اور آپ کی والدہ کی عصمت کے خلاف ایک بہتان کھڑا کیا۔ آپ کی پیدائش خرق عادت کے طور پر بِن باپ کے ہوئی۔ تو دشمنوں نے آپ کی والدہ کو ملامت کا ہدف بنایا اور کہنے لگے۔

(۱۹ : ۲۸)

یَا اُخْتَ هَارُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا۔

یعنی اے اختِ ہارون تیرا باپ بھی کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری والدہ بھی بدکار نہیں تھی۔ تُو نے یہ کیا حرکت کی۔ اس میں مخاطب تو حضرت مریمؑ صدیقہ کو کیا گیا مگر بالواسطہ حضرت عیسےٰؑ کو بھی نشانہ بنایا گیا حضرت مریمؑ جانتی تھیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اس کی حکمت کے تحت ہو رہا ہے۔

اس لیے خود جواب دینے کی بجائے بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو بھلا وہ کیا پوچھتے مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی کی زبانی حقیقت کچھ اس انداز سے واضح فرمائی کہ جہاں حضرت مریم کی عفت کا اظہار ہُوا وہاں حضرت عیسٰیؑ کا مقام۔ منصب اور حیثیت بھی ظاہر کر دی گئی۔ آپ نے فرمایا:

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ۔ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ۔ (۱۹ : ۳۰، ۳۱)

کہ میں اللہ کا بندہ ہُوں۔ اس میں یہ ساری باتیں آ گئیں کہ میری پیدائش اللہ کے امر سے ہُوئی۔ اور میں مخلوق ہُوں۔ الوہیت کی نسبت میری طرف نہیں جا سکتی اور میری زندگی بھی اسی کے حکم کی تعمیل میں گزرے گی۔ جس نے مجھے پیدا کیا۔ اور صرف یہی نہیں کہ میں خود اس کا مطیع ہوں، بلکہ مجھے منصبِ رسالت پر فائز کر کے مخلوق کو خالق کی اطاعت کرنے کا سلیقہ سکھانے پر مامور کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایسے شخص کا نہیں ہو سکتا جس کی پیدائش پر کوئی اعتراض کیا جا سکے یا جس کی سیرت داغدار ہو۔ پھر اپنی والدہ کی صفائی دی کہ

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ۔ (۱۹ : ۳۱، ۳۲)

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ عمر بھر اس کی عبادت کروں اور اپنی والدہ کا فرمانبردار رہوں یہ نہیں فرمایا کہ

وَبَرًّا بِوَالِدَیَّ

کہ میں اپنے والدین کا فرمانبردار رہوں جس سے یہ ظاہر فرمایا کہ میں بن باپ کے پیدا ہُوا ہُوں۔ اور میں خالق کی قدرت کا نشان ہوں اور

میری والدہ ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے بھلا کون ایسا کور باطن ہو سکتا ہے جو ایک نومولود بچہ کی زبان سے یہ حقائق سُن کر بھی اس پر یقین نہ کرے۔

اس مکالمہ کے بعد دشمنوں کو خاموش ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر بڑے ہو کر جب حضرت عیسٰیؑ نے دعوتِ حق کا آغاز کیا تو دشمن بھی تازہ ولولے کے ساتھ مقابلے میں آ گئے اور حق کے خلاف تحریک اُٹھائی۔ اور اسے یہاں تک پہنچایا کہ حکومتِ وقت حرکت میں آ گئی۔ ملکی قانون نے آپ کو مجرم قرار دیا اور دشمنوں کی مراد بر آئی۔ پھانسی دینے کا حکم ہُوا اور کسی کو پھانسی دے ہی دی گئی دشمن خوش ہُوئے کہ حق کی آواز ہمیشہ کے لیے دَب گئی۔ مگر جس کی پیدائش قدرتِ قادر کا ایک نشان تھا۔ اس کی زندگی بھی اسی کی قدرت کا نمونہ ہے اور اس کی حفاظت اور اس کے بچاؤ کا اعلان یُوں ہوا۔ کہ

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ (۴: ۱۵۷، ۱۵۸)

کہ تم بھلا اسے کہاں قتل کر سکتے تھے۔ ہم نے تم جیسے ناقدروں کو اس کی برکات سے محروم کرکے اسے اپنی طرف اُٹھا لیا۔

یہ تو دشمنوں کی کارستانیوں کا اجمالی پہلو ہے۔ اب اپنوں کی سُنیئے اُنہوں نے آپ کے پہلے بیان کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ کی تکذیب کی۔ عقیدت میں غلو کیا اور بندۂ خدا کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ اور بات یہاں تک بڑھائی کہ تین میں ایک اور ایک میں تین کا گورکھ دھندا کھڑا کر دیا۔ دشمنی تو ختم بھی ہو سکتی ہے کیونکہ دشمن کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ میں دشمنی کر رہا ہوں اس لیے ممکن ہے کہ کہیں اس کا ضمیر جاگ پڑے اور وہ توبہ کر لے مگر عقیدت

میں غلو ایسی بیماری ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں کیونکہ آدمی اسے خوبی سمجھتا ہے اور ظاہر ہے کہ آدمی کسی خوبی کو چھوڑ دینے کو کب تیار ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دوستوں کی اس حرکت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک نقشہ کھینچا ہے۔ جو روزِ جزا کو پیش آئے گا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ (۵:۱۱۶)...........
(۵:۱۱۷) مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِہٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ

یعنی سوال ہو گا اے عیسٰےؑ بن مریم کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لو۔ آپ عرض کریں گے اللہ! تیری ذات پاک ہے مجھے کیا زیب دیتا تھا کہ کوئی ایسی بات کہوں جو حق کے خلاف ہو....... مَیں نے تو اُنہیں یہی کہا جو تُو نے مجھے کہنے کا حکم دیا کہ اللہ کو معبُود سمجھو، میرا اور تمہارا رب وہی ہے اور ہم سب اس کی مخلوق اور اس کے محتاج ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دشمنوں کی دُشمنی تو سوہانِ رُوح ہوتی ہی ہے مگر دوستوں کی بدتمیزی بھی کوئی کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ مگر سالک کو دونوں خطروں سے آگاہ رہنا چاہیئے۔ دُشمنوں کی دُشمنی کے باوجود ان کی خیرخواہی کا جذبہ ٹھنڈا نہیں پڑ جانا چاہیئے، اور سب سے بڑی خیرخواہی یہی ہے کہ مخلوق کو اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے اللہ کی طرف دعوت دیتے رہنا چاہیئے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے فوزِ عظیم فرمایا ہے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ

اپنوں کی طرف سے جس بات کا خطرہ ہوتا ہے۔ آدمی اُسے خطرہ محسوس نہیں کرتا بلکہ نفس کو یہ صُورت بڑی مرغوب ہوتی ہے۔ کہ ساتھیوں کی عقیدت دیکھ کر آدمی کے اندر خود پسندی۔ عُجب اور کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ سالک کو یہ حالت پیش آجائے تو اس کے اندر شُکر گزاری کا جذبہ بڑھنا چاہیے اور اپنی کم مائیگی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے احساس کو بڑھ جانا چاہیئے۔

انانیت اور تکبّر وہ بیماری ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں اور یہ شیطان کا وہ ہتھیار ہے جس کا اسے ذاتی تجربہ بھی ہے اور اس کے وبال سے بھی وہ خوب واقف ہے اس لیے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سالک کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔ کیونکہ یہ وہ نشہ ہے جسے کوئی تُرشی اُتار نہیں سکتی اور یہ ایسی گمراہی ہے کہ اس سے پلٹنا محال ہو جاتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ احْفِظْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا

مجلسِ ذکر (۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ (۹ : ۱۲۸)

حقائق کا بیان ہو رہا تھا یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ جب سالک کا کوئی لطیفہ منوّر ہو جاتا ہے تو اس کی رُوح میں یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی مدد سے سالک اپنے اعمال کا جائزہ لے اور اس لطیفے کی خصُوصیت کا رنگ اس کی عملی زندگی میں ظاہر ہونے لگے۔ لطائف کا منوّر ہونا دو پہلوؤں سے سالک کی سیرت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک تو اس کی ذاتی سیرت کی تعمیر ہونے لگتی ہے۔ دوسرا وہ فیلڈ ورک کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اپنی استعداد کے مطابق ماحول کو متاثر کرتا ہے۔ اور خدا شناس معاشرہ کی تعمیر میں کوشاں ہوتا ہے۔

اب پانچویں لطیفے کا بیان ہو گا۔ اس کا نام "اخفیٰ" ہے۔ اس لطیفے کا فیض سالک کے باطن میں براہِ راست محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے آتا ہے۔ تصوّف و سلوک کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ زیرِ قدم محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ اس لطیفہ کے راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سالک میں اتباعِ سُنّت کی استعداد۔ جذبہ اور شوق

بیدار ہونے لگتا ہے۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا تاہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اوصاف تو اس قدر نکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں اس کا اعلان فرما دیا ہے۔ ان میں سے ایک وصف کا بیان ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱ : ۱۰۷)

یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مخلوق کے لیے رحمت بنا کے مبعوث فرمایا گیا ہے۔ مخلوق میں جمادات، نباتات، حیوانات، انسان، جن اور ملائکہ سب شامل ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کے علاوہ بھی مخلوق کی کوئی قسم ہو جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

مخلوق کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ہونے کی تفصیل بیان کرنا تو مجھ ایسے کم علم آدمی کے لیے ممکن نہیں ہاں اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کی ذات مخلوق کی مختلف اقسام کے لیے جس طرح رحمت ثابت ہوئی اس کے نمونے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں جا بہ جا ملتے ہیں اور حضورؐ کی تعلیمات میں اس رحمت کا نشان اس صورت میں ملتا ہے۔ کہ آپ نے مخلوق کے حقوق کے سلسلے میں جہاں انسانوں کے باہمی حقوق کی نشاندہی فرمائی۔ وہاں نباتات کے حقوق، حیوانات کے حقوق، جنات کے حقوق، ملائکہ کے حقوق بلکہ جمادات کے حقوق بھی متعین فرمائے اور انہیں ادا کرنے کی تاکید فرمائی۔ انسانوں کے باہمی حقوق کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو بعثت نبویؐ کے وقت تاریخِ عالم سے اقوامِ عالم کے حالات کا مطالعہ کیجئے۔ ہر قوم میں انسان بنی نوع کے حق میں درندہ بن چکا تھا۔

برِصغیر میں ہندو تہذیب نے آدم کی اولاد کو برہمنوں، ویشوں اور شودروں میں تقسیم کرکے مستقل نفرت اور نسلی امتیاز اور باہمی مخاصمت کو معراج تک پہنچا رکھا تھا کہیں زبان وجہ منافرت بنی ہوئی تھی۔ کہیں جغرافیائی حدود نے انسان کو انسان سے برسرِپیکار کر رکھا تھا کہیں رنگ نے انسان کو انسان کا دشمن بنا رکھا تھا اور سفید فام دُنیا باقی دُنیا کے رہنے والوں کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھی۔ غرض دُنیا کی حالت یہ تھی کہ ؎

سانپ تو سانپ کو نہیں ڈستا
آدمی آدمی کو ڈستا ہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارے امتیاز ختم کر دیئے۔ یہ سب بُت توڑ دیئے۔ یہ سب مصنوعی حد بندیاں ختم کر دیں اور اعلان فرمایا

کلکم بنو ادم و ادم من تراب۔

تم سب ایک آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم کی خلقت مٹی سے ہوئی۔ تو غرور کس بات کا۔ اکڑنا کس برتے پر اور اپنے بھائیوں کی تحقیر و تذلیل کس وجہ سے۔ آپ نے صرف یہ اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اپنے شاگردوں کی تربیت کرکے ایسے معاشرے کی تعمیر کی اور عملاً تعمیر کی کہ دوسروں کو مطلق خاطر میں نہ لانے والے قریشی کالے رنگ کے بلالؓ کو سیدنا بلالؓ کہنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ان سب مصنوعی امتیازات کو ختم کرکے حضورؐ نے عزت و برتری کا ایک بین الاقوامی اور عالمگیر اصول دیا کہ۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰکُمْ (۴۹:۱۳)

کہ تم میں سے معزز وہ ہے جس کا اپنے رب سے زیادہ تعلق

ہے۔ یعنی عزت کا معیار تعلق مع اللہ کو قرار دیا۔ کسی عربی کو عجمی پر کسی گورے کو کالے پر برتری جتانے کا غیر انسانی جذبہ ختم کر دیا۔ اور انسان جو انسان کا دشمن تھا۔ جس نے اپنے بنی نوع کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اِس پر حضورؐ کے فیض کا اثر یہ ہُوا کہ وہ جو دوسروں کا مال لُوٹنے میں فخر محسوس کرتے تھے اب دُنیا کے امین ترین انسان شمار ہونے لگے وہ جو دوسروں کی عصمتیں لُوٹتے تھے اب عصمتوں کے محافظ بن گئے۔ وہ جو دوسروں کو بے آبرو دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اب دوسروں کی آبرو کے پاسبان بن گئے۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

حضورؐ کی ذات میں جو سراپا رحمت تھی رحمت کے وُہ نشان ملتے ہیں کہ انسانی تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ حضورؐ کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی غلام اسلام قبول کرنے کے لیے آتا ہے وُہ منظر چشمِ تصوّر کے سامنے آجاتا ہے کہ کس طرح بے دردی سے اس نے قتل کیا۔ پھر کس طرح کلیجہ نکالا گیا اسے چبایا گیا۔ اور اب جب کہ وہ بے بس ہے۔ حضورؐ کو پُوری قدرت حاصل ہے کہ اس سے انتقام لیں مگر رحمتِ عالم کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ اس کو مسلمان کیا جاتا ہے۔ بس اتنا کہا جاتا ہے کہ کسی اور شہر میں جا کر رہے کہ اس کے سامنے آنے سے چچا کے قتل کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔

۱۳ برس تک مکّے والے حضورؐ کو ہر وہ ایذا دیتے ہیں جس کا ایک نام کا انسان بھی تصوّر نہیں کر سکتا ہے۔ مگر فتح مکّہ کے موقع پر جب حضورؐ

فاتحانہ مکہ میں داخل ہوتے ہیں تو ان تمام درندہ صفت انسانوں کو مجرم کی حیثیت سے حضورؐ کے سامنے لاکھڑا کیا جاتا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے سر قلم کر دیئے جاتے۔ ان کی لاشوں کو روندا جاتا۔ ان کی بوٹیاں کتوں اور گدھوں سے نچوائی جاتیں مگر رحمۃ للعالمینی کا مظاہرہ کیسے ہوتا۔ اور وہ ہو کر رہا۔ اور حضورؐ نے اعلان فرما دیا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء

میرے جانی دشمنو! جاؤ تم آزاد ہو میں تمہیں کوئی سزا نہیں دیتا

یہ رویہ رحمت للعالمین کے سوا اور کون اختیار کر سکتا ہے۔

اس لطیفہ کے راسخ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ سالک کی سیرت پر حضورؐ کی اس رحمۃ للعالمینی کی جھلک پڑنے لگے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑے وہ روٹھنے والوں کو منائے وہ گرتوں کو سہارا دے وہ گم کردہ راہ لوگوں کو راہِ ہدایت پر لائے وہ تباہ ہونے والوں کو تباہی سے بچالے۔ وہ بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارے وہ بیماروں کا علاج کرے۔ وہ دشمنوں کی دشمنی بھول جائے وہ دوستوں کی بے جا حمایت سے بچے اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے ہو اور دشمنی بھی اللہ کے لیے ہو۔ اور اس کی ہر ادا زبانِ حال سے کہہ رہی ہو ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دُنیا میں تیرا نام رہے

حضورؐ کی دُوسری خصوصیات کا اعلان ان الفاظ میں ہُوا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳ : ۲۱)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اس میں ایک تو زندگی کے کسی خاص پہلو کی تخصیص نہیں۔ بلکہ مطلق ہے۔

جس سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا ہو گا۔ حاکم اور رعایا کے لیے امیر اور غریب کے لیے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے لیے جج اور مستغیث کے لیے۔ سپاہی اور جرنیل کے لیے۔ تاجر اور گاہک کے لیے زندگی کے ہر پہلو میں حضورِ اکرمؐ کی زندگی میں رہنمائی موجود ہے اور انسان کی کامیابی اور سکون کا راز حضورؐ کی اتباع میں ہی پوشیدہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی خاص قوم، ملک یا زمانہ کے ساتھ تخصیص نہیں بلکہ قیامت تک اقوامِ عالم کے لیے حضورؐ کی زندگی ایک کامل نمونہ ہے۔

اِس لطیفہ کے منوّر اور راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سالک میں اتباعِ سنّت کی کامل استعداد پیدا ہو چکی ہے۔ اب اسے اپنی روز مرہ کی زندگی کا جائزہ لینا ہے اور بڑی احتیاط، عقیدت اور اخلاص کے ساتھ ہر قدم پر یہ دیکھنا ہے کہ اتباعِ سنّت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ترکِ سنّت اور خلافِ سنّت میں فرق ہے ترکِ سُنّت کی وجہ غفلت بھی ہو سکتی ہے۔ نادانی اور جہالت بھی ہو سکتی ہے یہ دونوں حالتیں نسبتاً کم نقصان دہ ہیں مگر ارادۃً ترکِ سُنّت لازماً سالک کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ کام تو بہرحال کرنا ہے اگر سنّت کے مطابق نہ ہُوا تو لازماً اپنا تجویز کردہ طریقہ ہو گا یا رسم و رواج کی پابندی ہو گی۔ دونوں صورتوں میں سنّت کی بے قدری ظاہر ہے۔

خلافِ سُنت کرنے کی بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اوّل عدمِ علم بظاہر یہ ایک معقول عذر ہے مگر اس کا نقصان لازمی ہے جیسے کوئی شخص عدمِ علم کی بنا پر زہر کھالے تو گو وہ خودکشی کا مجرم قرار نہ دیا جائے۔ مگر یہ عدمِ علم اس کی ہلاکت کی راہ میں حائل نہ ہو سکے گا۔ دوسری وجہ جان بوجھ کر خلافِ سنّت کام کرنا ہے یہ حرکت پرلے درجے کی مجرمانہ جسارت ہے۔ جب ایک شخص عہد کر چکا ہے۔ کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کے ہر معاملے میں اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہوں پھر عمداً حضور اکرمؐ کی مخالفت کرنا بدعہدی بھی ہے۔ منافقت بھی اور اکڑفوں کا مظاہرہ بھی اللہ تعالیٰ اس حماقت سے محفوظ رکھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی تو عام ہے۔ ساری مخلوق اس سے حِصّہ لے رہی ہے، مگر آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے دو اوصاف کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد ہے۔

لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔(۲۱:۳۳)

یعنی فکر و عمل کی سمت کا دُرست ہونا ضروری ہے یہ یقین دل میں موجود ہو کہ مجھے ایک روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کھڑے ہو کر اپنے اعمال کے متعلق جواب دینا ہے۔ اور اعمال کا نقشہ یہ ہو کہ ہر حال میں اللہ کی یاد دل میں موجُود رہے اور عمل سے اس کا اظہار ہوتا رہے گویا عملی زندگی میں جب تک ذکرِ کثیر کی عادت نہیں ہوتی۔ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی مشکل ہے۔ ذکرِ کثیر ہی اتباعِ سنّت کا محرک ہے اور سالک نے ذکرِ کثیر کی بدولت جب اپنے لطائف کو منوّر کر لیا ہے۔ تو اب اس

کے سامنے اتباعِ سنت کے راستے میں کون سی رکاوٹ باقی رہ گئی۔

اطاعت عموماً اس شخص کی کی جاتی ہے جس کے متعلق گمان غالب ہو کہ یہ میرا خیر خواہ ہے اور اس سے میرے کئی کام متعلق ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں بھی حضورؐ کی حیثیت بیان فرما دی کہ

عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ

یعنی تمہاری تکلیف دیکھ کر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دل دکھتا ہے۔ پھر حَرِیْصٌ عَلَیْکُم یعنی حضور ہر وقت تمہاری بھلائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ جس شخص میں یہ دو وصف موجود ہوں اس سے بڑھ کر خیرخواہ کون ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی کوئی شخص اپنی زندگی میں حضورؐ کے اسوہ کو نمونہ کے طور پر اپنے سامنے نہ رکھے تو اس سے زیادہ بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے۔

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی سیرت کا یہ پہلو ایک حدیث میں بیان فرما دیا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ یوں سمجھو کہ گھپ اندھیری رات ہے۔ جنگل بیابان ہے۔ ایک شخص آگ روشن کرتا ہے۔ چاروں طرف سے پروانے جمع ہو جاتے ہیں اور لپک لپک کر آگ میں گرتے ہیں وہ شخص کنارے کھڑا دونوں ہاتھوں سے پروانوں کو ہٹا رہا ہے آگ سے بچانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ رُکنے کا نام نہیں لیتے آگ میں گرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ میری حیثیت اس آدمی کی سی ہے اور تمہاری حالت ان پروانوں کی ہے۔ تم جہنم کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہو اور مَیں تمہیں اس آگ سے بچانے کی مسلسل کوشش میں مصروف ہوں۔

ظاہر ہے کہ پروانے آگ سے بچ جائیں تو روکنے والے کا کچھ نہیں سنورتا۔ اور اگر وہ جل جائیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا پھر بھی وہ برابر روکتا چلا جاتا ہے۔ جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اس کے دل میں خیر خواہی کے جذبات بھرے ہیں۔ اور اس کی مسلسل جدوجہد کا محرک صرف ان کی خیر خواہی کا جذبہ ہے۔

اطاعت اور اتباع میں بڑا فرق ہے۔ اطاعت یہ ہے کہ حکم ملے اور تعمیل کر دے مگر اتباع یہ ہے کہ حکم کے انتظار پر ہی اکتفا نہ کرے۔ بلکہ مطاع کی پسند و ناپسند دیکھ کر اس کے مطابق زندگی کا نقشہ بنائے۔ اس کی ہر ادا کو محبوب سمجھے اور ہر حرکت میں اس کی تقلید کی فکر میں رہے اور یہ صورت صرف اس وقت ممکن ہے۔ جب مطاع، محبوب بھی ہو۔ ورنہ اطاعت محض ضابطے کی کارروائی ہو گی اس کے اندر رُوح مفقود ہو گی۔ حضورؐ کی حیثیت محض مطاع کی نہیں بلکہ محبوب مطاع کی ہے۔ جبھی تو آپ نے فرمایا کہ

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (کما قال)۔

یعنی آدمی کامل مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک اسے تمام محبوب چیزوں سے بڑھ کر مجھ سے محبت نہ ہو۔

محبت ایک جذبہ ہے یہ دل کا فعل ہے اس لیے اس بارے میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں ایک صورتِ محبت ہے ایک حقیقتِ محبت ہے۔ صورتِ محبت سے حقیقی محبت کو دھوکا بھی دیا جاتا ہے اور لوگ دھوکا کھا بھی جاتے ہیں۔ صورتِ

محبت میں ساری قوت نمائش اور نعروں میں ہی صرف ہوتی ہے۔ اور ساری کوشش تصنع، بناوٹ اور اشتہار تک ہی محدود رہتی ہے۔ سنت کے مطابق کام کرنے سے تسلی نہیں ہوتی اس لیے سنت میں پیوند لگائے جاتے ہیں اضافے کئے جاتے ہیں قطع و برید شروع ہو جاتی ہے۔ ترمیم و تجدید کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقے سے نظر فریبی اور سامعہ نوازی کا شوق پورا ہو جاتا ہے مگر سنت کی توہین یقیناً ہوتی ہے۔ جیسے پٹرول میں مٹی کا تیل ملا دینے سے مقدار تو بڑھ جاتی ہے۔ مگر انجن کا ستیاناس ہو جاتا ہے اور گاڑی بیکار ہو جاتی ہے۔ پٹرول میں جب مٹی کا تیل ملتا ہے تو اس کی قوت کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ اس لیے محض صورت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ اس کے بڑے دُور رس نتائج ہوتے ہیں اور ایسا کرنے سے کئی چھپی ہوئی بیماریوں کا سُراغ ملتا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ سُنت کی شکل کو بدلنے اور اس میں من مانے اضافے کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاذ اللہ نبی کریمؐ نے دین کو نامکمل چھوڑ دیا اب میں اس کی تکمیل کر رہا ہوں۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین پہنچانے میں غفلت برتی (معاذ اللہ) یہ بات دین کا حصہ تھی آپ نے نہیں پہنچائی۔

۳۔ اس حرکت سے انکارِ ختمِ نبوت ظاہر ہوتا ہے اور ایسا کرنے والا درحقیقت خود مدعیٔ نبوت ہوتا ہے گو زبان سے نہ کہے کیونکہ دین یا عبادت کی شکل متعین کرنا نبی ہی کا کام ہے غیرنبی کا یہ منصب نہیں۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
حاصلِ خواجہ بجز پندار نیست

حقیقی محبت کے انداز ہی دوسرے ہوتے ہیں وہاں نہ تصنع ہے نہ بناوٹ نہ نمائش ہے، نہ نعرہ بلکہ کہنے والے کہتے ہیں:

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز

وہ کیسے ؟

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

کاملین تو جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے۔ محبوب کی مقرر کردہ حدود و قیود سے سرِمُو انحراف نہیں کرتے بلکہ نازک ترین مواقع پر بھی ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

با چنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

محبُوب نے خود محبت کا معیار بتا دیا کہ

من احب سنتی فقد احبنی

جسے میری سنّت محبوب ہے وہ میری محبت کے دعوے میں سچّا ہے۔ ورنہ

دبدونها خرط القتاد

مختصر یہ کہ پانچویں لطیفے کے راسخ ہونے کی علامت یہ ہے کہ آدمی کے اندر اتباعِ سنّت، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور مخلوق کی بھلائی اور بہتری کا جذبہ روز بروز ترقی کرتا چلا جائے۔

به مصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر به او نرسیدی تمام بولہبی است

سالک کا وجود تبلیغ مجسّم ہو۔ سالک کے شب و روز سے یہ ظاہر ہو کہ اس کے ہر عمل پہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کا ٹھپہ لگا ہُوا ہے

دیکھئے حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں کتنے آدمی دائرہِ اسلام میں آئے۔ پھر مدینہ طیّبہ میں چھ برس آزادی کے گزرے مگر اہلِ مکّہ سے مقاطعہ کی صُورت تھی۔ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر کل ۱۴۰۰ کے قریب آدمی اس مہم میں ساتھ تھے۔ مگر صلح نامہ میں ایک شرط یہ رکھی گئی کہ کہ اہلِ مکہ اور مسلمانوں کو آپس میں ملنے جلنے کی آزادی ہو گی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد اتنی تھی کہ متحرک انسانوں کا ایک سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ مؤرخین خواہ کچھ ہی بتائیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کفّار نے جب مدینہ کے مسلمانوں کو قریب سے دیکھا۔ ان سے ملے جُلے، لین دین کیا۔ تو انہیں محسوس ہونے لگا کہ یہ لوگ ہماری ہی قوم اور قبیلوں کے افراد ہیں مگر ان کی اور ہماری زندگی میں وہی فرق ہے جو ایک انسان اور جانور کی زندگی میں ہوتا ہے تو اُنہیں تسلیم کرنا پڑا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات واقعی اس قابل ہیں کہ اُنھیں اپنایا جائے۔ گویا صحابہ کرامؓ کے وجُود ہی مجسّم تبلیغ بن چکے تھے ان کے افکار، ان کے اعمال، ان کے رہن سہن، ان کی معاشرت، زبانِ بے زبانی میں وہ سب کچھ کہہ جاتی جسے کہنے کے لئے ایک بے عمل مبلغ کو سٹیج

سجانے پڑتے ہیں۔ آلۂ جہیر الصوت کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر نتیجہ وہی کہ الفاظ زبان سے نکل کر فضا میں گم ہو جاتے ہیں اس لیے سالک کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسوۂ حسنہ مشعل راہ بنائے رکھے۔

چھٹا لطیفہ

اصطلاحِ سلوک میں اس کو نفس کہتے ہیں۔ نفس، انسان کے اندر ایک قوت ہے جس سے وہ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے۔ خواہش اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی۔ اِس اختلاف کی بنا پر نفس کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں اور ان کے نام بھی مختلف ہیں۔ مثلاً چونکہ اکثر برائی اور فوری لذت کی خواہش کرتا ہے۔ جب یہ خواہش کر بیٹھے تو اس پر نادم بھی نہ ہو تو اُسے نفسِ امّارہ کہتے ہیں یعنی وہ قوت جو اکثر بُرائی کی خواہش میں ہی آتی ہے اسی صورت کو ہویٰ یا ہوائے نفس بھی کہتے ہیں۔ اور اگر نفس بُرائی کی خواہش کرے۔ مگر اس پر ندامت بھی ہونے لگے تو اسے نفسِ لوّامہ کہتے ہیں۔ یعنی اپنے کئے پر ملامت کرنے کا احساس بھی پایا گیا اور اگر یہ قوّت اکثر نیکی اور بھلائی کی خواہش کرنے لگے تو اسے نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔

اس لطیفہ کی تربیت کا مطلب یہ ہے کہ سالک اس قوّت کو اللہ کے ذکر کے ذریعے اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ اکثر خیر کی خواہش پیدا ہونے لگے۔ اس لطیفہ کے راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سالک کے اندر یہ قوّت اب صحیح رُخ پر کام کرنے لگی ہے۔ نیکی کی رغبت اور

بُرائی سے نفرت ہونے لگی ہے۔

یوں تو شیطان، انسان کا ازلی دشمن ہے مگر نفس اس سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ شیطان کے اندر بھی تو نفس ہی نے استکبار کی خواہش پیدا کرکے اسے گمراہ کیا تھا۔ اس لیے اسے مغلوب کرنا مشکل کام ہے۔ اسی لیے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجاہدہ نفس کو جہادِ اکبر فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک برگزیدہ رسُولؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تَتَّبِعَ الْهَوٰی فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ (۳۸ : ۲۶)

یعنی ہوائے نفس کا اتباع مت کیجئے ورنہ یہ اتباع تمہیں راہِ حق سے ہٹا دے گی۔ دُوسرے مقام پر ایک اصولی تعلیم فرمائی۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ (۷۹ : ۴۰، ۴۱)

یعنی جسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا خوف ہوا اور اس نے اپنے آپ کو ہوائے نفس کی اتباع سے بچا لیا وہ جنّت کے انعام کا مستحق ہوا۔ معلوم ہوا کہ ہوائے نفس کی اتباع گمراہی ہے اور ہوائے نفس سے بچنا اصل کامیابی ہے۔

خواہشاتِ نفسانی کی کوئی حد نہیں یہ ایک ایسا جنگل ہے کہ اس میں جو پھنس گیا وہ پھڑ پھڑا تو سکتا ہے لیکن نکلنا محال ہے کیونکہ خواہش پرستی انسان کی دُشمن ہے۔ مگر محبُوب دُشمن اس لیے خواہشات جُوں جُوں پُوری ہوتی ہیں۔ ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہی جاتا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

انسان اپنی ہوائے نفس کو پُورا کرنے کے لاکھ جتن کرتا ہے۔ کہیں حبِ جاہ ہے کہیں حبِ مال ہے کہیں تلاشِ راحت ہے کہیں جستجوئے لذت ہے۔ انسان ان کے حصول کے لیے سارے جتن کرتا ہے مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

گھٹتا جاتا ہے خطِ پیمانہ
بڑھتی جاتی ہے تشنگی ساقی

ذکرِ الٰہی کی برکت سے اس قوت کی تسخیر یوں ہوتی ہے کہ اب نفس زیادہ تر خیر کی خواہش ہی کرنے لگتا ہے۔ مگر خیر کیا ہے تفصیل میں پڑے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ اصل خیر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کے مُطابق زندگی بسر کرنے کا عزم اور سلیقہ سیکھ لو۔ تو صورت یہ بنی کہ سالک اپنی پسند سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اور اپنی پسند کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پسند کے تحت کر دیتا ہے۔ خواہش ہمیشہ پسندیدہ چیز کی ہوتی ہے۔ جب سالک نے اپنی پسند کو حضورؐ کی پسند کے تحت کر دیا تو لازماً وہ خیر ہی کی خواہش کرے گا۔ یہ جو عام طور پر مشہور ہو گیا کہ نفس کشی کرنا ہی سلوک و تصوّف ہے یہ اس خاص مفہوم کے اعتبار سے غلط ہے۔ نفس مارنا نہیں بلکہ نفس کو سدھانا، سنوارنا اور صحیح راہ پر لگانا ہے یعنی اس سے کام لینا ہے۔ مگر صحیح کام۔ اگر یہ مرگیا تو گویا وہ قوت ہی ختم ہو گئی جو خواہش کرتی تھی۔ خواہ وہ خواہش خیر ہو یا خواہشِ شر۔ تو وہ زندگی کیا ہوتی۔

اگر کوئی نابینا آدمی کہے کہ ہم تو بھئی کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے تو اس میں کون سا کمال ہوا۔ بات جب ہے کہ شعور حُسن کا ادراک موجود ہے۔ دو کھلی آنکھیں موجود ہیں پھر بھی غیر محرم کی طرف نظر نہیں اُٹھتی۔ یہ کیوں ؟

اس لیے کہ اب اس قوّت کی تربیت ہو چکی ہے۔ محبوب کو اس طرف آنکھ اُٹھانا پسند نہیں اس لیے اب آنکھ کھُلی ہے مگر نظر نہیں اُٹھتی۔

ہاں اس لحاظ سے نفس کشی کہا جائے کہ نفس میں جو بُرائی کی خواہش تھی وہ مر گئی۔ تو مفہوم درست ہے مگر درحقیقت اس کا عام فہم اور واضح مفہوم یہ ہے کہ نفس کی صحیح تربیت ہو گئی۔

اس لطیفہ کا خاصہ یہ ہے کہ سالک میں "فانی" کی محبت اور اس سے حصولِ لذت کا جذبہ گھٹنے لگے۔ اور "باقی" کی محبت اور ابدی راحتوں کے حصول کی خواہش بڑھنے لگے۔ اور جب یہ جذبہ درست ہو جائے اور قوّت صحیح سمت میں کام کرنے لگے تو اس کے سامنے صرف وہی صراطِ مستقیم ہو جس کے سرے پر نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کھڑے بُلا رہے ہوں کہ

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲:۱۰۸)

میرا راستہ یہی ہے اِسی پر بڑھتے چلے آؤ۔ مَیں تمہیں اللہ کے پاس لے جاؤں گا۔ اور اِسی پر وہ قافلے چلے آئے ہیں جنہوں نے میرے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف میرا اتباع کیا۔

مجلسِ ذِکر (۵)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا (۱۷: ۳۶)

چھ لطائف ان کی تربیت۔ سالک پر ان کے اثرات اور سالک کی عملی زندگی سے ان کا تعلق بیان ہو چکا۔ اب ساتویں لطیفے کا بیان ہو گا۔ اس لطیفے کا اصطلاحی نام سلطان الاذکار ہے۔ اسے لطیفہ قالبیہ بھی کہتے ہیں۔

قلب جب منور ہو جاتا ہے تو قالب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ باطن کا جب تزکیہ ہو جاتا ہے تو ظاہر اس کی شہادت دیتا ہے۔ بیٹری جب چارج ہو جاتی ہے تو اس سے بلب بھی روشن ہوتے ہیں موٹر بھی حرکت میں آ جاتی ہے۔ ٹارچ میں جب نئے سیل ڈالے جاتے ہیں تو وہ روشنی پھیلنے لگتی ہے۔ سیل کے بغیر ٹارچ محض کھوکھا ہے ایک کھلونا ہے جس کام کے لیے اسے بنایا گیا وہ کام نہیں دے سکتی۔ بیٹری اگر ڈاؤن ہو گئی ہے یا ختم ہے تو موٹر خواہ کتنی قیمتی ہو سواری کا کام نہیں دے سکتی۔ باطن کا جب تک تزکیہ نہ ہو تو ظاہر آوارگی اور بے مقصدیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ قلب جب تک منور نہ ہو قالب پر ظلمتیں چھائی رہتی ہیں۔ تزکیہ باطن یا لطائف کا جاری ہونا۔ منور ہونا، راسخ ہونا ایسا ہے جیسے بیٹری چارج ہو گئی۔ سٹیم کا ذخیرہ ہو گیا اب اس بیٹری یا سٹیم سے کام لینا ہے یہ سب فیلڈ ورک کے

یہ تیاری تھی کس کام کی بنیاد تھی۔
انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو آلہ کار اس کے اعضا ہوتے ہیں
باطن سے ارادہ اُٹھتا ہے اعضاء حرکت میں آ جاتے ہیں اور یہ
قالب یا جسمِ انسانی چند اعضاء کا مجموعہ ہی تو ہے۔ سلطان الاذکار کی
تربیت یوں ہوتی ہے کہ اسمِ ذات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا
اثر سارے قالب میں جاری و ساری ہو جائے جیسے بجلی کے مثبت
تار کو جب مس کیا جائے تو برقی رو سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔
رُواں رُواں محسوس کرتا ہے اسی طرح سلطان الاذکار سے سارے بدن
کو تمام اعضاء کو، بال بال کو، خون کے ہر قطرے کو ذاکر بنایا جاتا ہے
اس لطیفے کے راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رگوں میں جو خون دوڑ
رہا ہے اس میں صلاح و تقویٰ کے کاپسل شامل کر دیئے گئے۔ اس نے
ذہن کو جو قوت دی اس سے اس کی سوچ کی سمت رضائے الٰہی کی
طرف ہو گئی ہاتھ اُٹھے تو مخلوق کی بہتری کے لیے اور حق کی معاونت
کے لیے، آنکھوں نے حق کے بغیر دیکھنے سے انکار کر دیا۔ کان حق کی آواز
سُننے پر آمادہ رہے۔ غرض جسم کا ہر عضو حق کی سربلندی اور مخلوق کی
بہتری میں مشغول ہو گیا۔ چونکہ قربِ الٰہی کا مدار عمل پر ہے اور اس عمل
کا مدار اعضاء پر ہے۔ اس لیے فرائض کی ادائیگی کے متعلق سوال بھی
انہی سے ہو گا۔

ارشادِ باری ہے کہ
إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (۱۷:۳۶)
انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ زیادہ تر سامعہ اور باصرہ سے

ی ہوتی ہے اور ان معلومات کی روشنی میں عمل کا ارادہ قلب سے اُٹھتا ہے اس لیے انہی سے باز پُرس بھی ہو گی اور ان قویٰ سے غلط کام لینے والے اس کا اعتراف کریں گے۔ اور کہیں گے۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ۔ (۶۷ : ۱۰)

یعنی اگر ہم اہلِ اللہ سے اللہ کی باتیں گوش ہوش سے سُنتے یا خود صحیح سمت میں سوچتے۔ تو آج دوزخ کا ایندھن نہ بنتے۔

یہاں ایک نکتہ ضمناً سامنے آگیا۔ انسان دو قسم کے ہی پائے جاتے ہیں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو اہلِ علم پر اعتماد کرکے اُن کی سُن کر زندگی کی راہ متعین کرتے ہیں ان کو اربابِ تقلید ہی کہا جا سکتا ہے۔ دُوسرے وہ ہوتے ہیں جو ماہرین پر اعتماد کرنے کی بجائے خود تحقیق کی کوشش کرتے ہیں اگر وہ تحقیق کے واقعی اہل ہوں اور تحقیق کے لیے مطلوبہ شرائط بھی پُوری کریں تو راہِ ہدایت پا لیتے ہیں۔ صرف اہلِ حق کی تقلید سے بڑھ سکتے ہیں۔ اور چونکہ ہر مدعیٔ تحقیق اور منکر تقلید محقق تو ہوتا نہیں اس لیے انہیں تقلید کرنا ہی پڑتی ہے۔ تو آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہُوا کہ دوزخ سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں اہلِ فن کی تقلید یا حقیقی تحقیق۔

جوابدہی اور مؤاخذے کی بات چل رہی ہے تو کہیں یہ خیال نہ آنے پائے کہ عمر بھر جس زبان سے جھُوٹ سچ بیان بازی سے کام لیتے ہیں کیا اس وقت یہ گنگ ہو جائے گی۔؟ بات یہ ہے کہ زندگی کے سارے اعمال صرف زبان ہی سے نہیں ہوتے جسم کے تمام اعضاء اپنی اپنی استعداد کے مطابق کاروبارِ حیات میں حصہ لیتے ہیں۔ پھر انسان اس زبان کو سچ اور

جھوٹ دونوں جگہ استعمال کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کاغذ پر انگوٹھا لگایا۔ زبان سے انکار کر دیا۔ کہ میرا انگوٹھا نہیں مگر وہ نقوش جب ماہر کے سامنے آتے ہیں تو فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ انگوٹھا اسی کا ہے۔ زبان نے تو انکار کر دیا مگر ہاتھ انکار نہ کر سکا۔ تو وہاں بھی مواخذہ کے وقت کچھ ایسی کیفیت ہو گی۔

ارشادِ باری ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (۳۶ : ۶۵)

یعنی وہاں بولنے کی اجازت نہ ہو گی۔ بلکہ انسان دیکھے گا۔ کہ ہاتھ بولتے ہیں، پاؤں بولتے ہیں اور صاف صاف اقرار کر رہے کہ اس بھلے مانس نے ہم سے یہ کام لیا۔

دوسرے مقام پر مواخذے کا منظر ذرا تفصیل سے کھینچا گیا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۴۱ : ۲۰)

یعنی جب وہ جواب دہی کے لیے پیش ہوں گے۔ ان کے کان ان کی آنکھیں بلکہ ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔ یہ سُن کر وہ لوگ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ یہ تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے۔ انہیں کیا ہو گیا مگر بات سوچ تک ہی محدود نہ رہے گی کہ

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔ (۴۱ : ۲۱)

اپنی کھالوں سے کہیں گے اے ہماری بے زبان کھالو! تمہیں بولنے کا

یارا کیسے ہوا۔ جواب دیں گی۔ ارے عقل کے اندھو اور خالق کی قدرت سے آنکھیں پھیر لینے والو۔ جس نے گوشت کے ایک ٹکڑے زبان کو وہاں قوتِ گویائی دی تھی کیا یہاں ہمیں گویائی دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔

لطیفۂ قالبیہ کی تربیت کا اثر یہ ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ کان، آنکھ، زبان بلکہ تمام اعضاء کے استعمال میں محبوب کی پسند کو سامنے رکھتا ہے۔ اس کے کان کوئی نامناسب آواز سُننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس کی آنکھ کسی ناروا منظر کی طرف اُٹھ نہیں سکتی۔ خواہ وہ کتنا مرغوب ہی کیوں نہ ہو اس کی زبان سے نامناسب کلمات ادا نہیں ہو سکتے اس کے پاؤں غلط سمت میں اُٹھنے سے انکار کر دیتے ہیں اس کے ہاتھ کسی کی ایذا دہی کے لیے گویا شل ہو جاتے ہیں۔ اس کی سوچ کا نقطۂ ماسکہ رضائے الٰہی کے حصول کی تدابیر کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

اگر تزکیۂ باطن نہ ہو یا ایسا ہو کہ لطیفۂ قالبیہ پر اثر انداز نہ ہو تو انسان کی حالت بالکل اسی طرح ہو جاتی ہے جیسے کسی موٹر کا ٹائی راڈ کھُل گیا ہو۔ سٹرنگ گو ڈرائیور کے ہاتھ میں ہے مگر موٹر اس کے بس میں نہیں کسی دیوار سے ٹکرائے یا کسی کھڈ میں گرے۔ ڈرائیور اسے روک نہیں سکتا۔ ایسے مناظر دیکھنے ہوں تو اپنے گردوپیش نظر دوڑائیں۔ نوجوان نسل کے مشاغل پر نگاہ کریں۔ آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے۔ ان بے چاروں کے ٹائی راڈ کھُل چکے ہیں بلکہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ ریڈیو یا ٹرانسسٹر کے گرد جمع نوجوانوں کو دیکھئے جب کسی گانے کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ تو پہلے ساز بجتا ہے اس پر مقابلے ہوتے ہیں گانا

شروع نہیں ہوا۔ مگر جوان بتا دیتے ہیں یہ فلاں فلم کا گانا ہے۔ فلاں مغنیہ نے گایا ہے۔ نگاہیں آوارہ ہو چکی ہیں۔ کان اس زہر کے رسیا ہو چکے ہیں، بڑے بوڑھے کچھ عرصے پہلے ان مناظر کو دیکھتے تھے مگر ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے رہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ خاندان کے بڑے اپنے کنبے کو لے کر بڑے اہتمام سے ریڈیو اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور فحش گانوں اور عریاں تصاویر کو دیکھ کر لطف اندوز ہونے میں جوانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں گویا اب ڈرائیور نے بھی سٹیرنگ سے ہاتھ اُٹھا لیا اور کہنے لگے ؏

تو بھی بدل امیر زمانہ بدل گیا

آپ کہیں گے ایسا محتاط اور اس درجے کا ہوشیار کون ہو سکتا ہے کہ اس کے جسم کے کسی حصے سے کوئی لغزش نہ ہونے پائے۔ واقعی ایسا کوئی نہیں یہ کام صرف انبیائے کرام ہی کا ہے۔ درست! مگر اس کا علاج بھی حکیم مطلق کے نمائندے نے بتایا ہے۔ مگر لغزش اور ڈھٹائی میں فرق ہوتا ہے۔ غلطی اور ''سرکشی'' دو مختلف چیزیں ہیں۔ ڈھٹائی خود کشی ہے لغزش بیماری ہے اور ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ اس کا علاج بتانے والے نے بتایا کہ

التائب من الذنب کمن لاذنب له

یعنی جو ٹھوکر کھا کر پچھتایا۔ جسے لغزش کے بعد ندامت ہوئی اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ جیسے لغزش سرے سے ہوئی ہی نہیں اس انابت کے بعد اگر تلافی مافات کے لیے کوشاں ہو گیا تو اعلان ہے کہ

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَات

کہ اطاعت اور انابت لغزش کے اثر کو محو کر دیتی ہے۔ ممکن ہے حساس آدمی اس سے بھی کسمسائیں کہ نیکیوں نے برائیوں کو مٹا دیا مگر برائی کا نشان تو پکار پکار کر کہے گا کہ پہلے یہ حرکت ہوئی کیا منہ دکھائیں گے مگر اللہ بڑا کریم ہے۔ وہ تو برائی کا نشان بھی محو کر دے گا آپ دیکھتے نہیں کہ اس نے اپنے شاہکار انسان کو وہ عقل عطا فرمائی کہ وہ اپنی برائیوں کو خود اس طرح محو کر سکتا ہے کہ اس کا نشان تک نہیں رہنے دیتا آپ پوچھیں گے وہ کیسے۔ دیکھئے کسی گانے کے رسیا نے کوئی فحش گانا ٹیپ کر لیا۔ کہ جب جی چاہا سُن کے مزے لیں گے مگر اس کے ضمیر نے کچوکا دیا۔ انسانیت جاگ اُٹھی خیال آیا اس ریل کو ضائع کر دیں مگر مادی ذہن ایسے نقصان کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ تجویز سوچی کہ اس پر کسی اچھے قاری کی قرأت یا کوئی نعتیہ کلام ہی ٹیپ کر لیں۔ ایسا کر ڈالا۔ دیکھئے وہی کیسٹ ہے جس پر فحش گانا ٹیپ کیا تھا۔ مگر اب اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ اسی طرح نیکیاں برائیوں کو محو کر دیں تو کیا بعید ہے بلکہ اس کی شان کے لائق ہی یہی ہے۔

ایک اور مژدہ سُنیے ارشاد ہوتا ہے۔

خیر الخطائین التوابون

خطاکار بُرا سہی مگر ان بروں میں سے کچھ اچھے ہیں وہ کون ؟ وہ خطاکار جن سے لغزش ہو جائے تو ابلیسیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر اکڑتے نہیں۔ اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ نادم ہو کر گڑگڑا کر اپنے رب سے معافی مانگتے ہیں۔ اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم مصمم کر لیتے ہیں۔

لطیفۂ قالبیہ کے راسخ ہونے پر سالک کو اپنی عملی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لینا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ کہ باطن کے تزکیہ نے اس کے ظاہر کو بھی بدلا ہے یا نہیں گویا سلوک کی ابتدا ہی یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن کو سنوار دیتا ہے۔ اس کی فکر و عمل کی دُنیا میں خوشگوار اور صالح انقلاب آجاتا ہے۔ انفرادی طور پر وہ ایک اچھا انسان اور اجتماعی اعتبار سے وہ معاشرے کا بہترین فرد بن جاتا ہے۔

مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں۔

جب باطن میں انوار جاگزیں ہوتے ہیں تو اعضاء اس کی شہادت دیتے ہیں۔

سلوک کی بُنیاد یہ لطائف ہیں۔ اس لیے تصوف و سلوک کی تربیت کے لیے ہر مکتبِ فکر میں ابتدائی طور پر یہ لطائف کرائے جاتے ہیں۔ قادریہ، نقشبندیہ چشتیہ، سہروردیہ ہر سلسلہ میں ان لطائف کو سلوک کی بُنیاد قرار دیا گیا ہے اور ان لطائف کی تربیت ذکرِ الٰہی ہے۔ نقشبندیہ میں ابتدا ہی سے ذکرِ خفی کرتے ہیں اور انتہا بھی ذکرِ خفی پر ہوتی ہے۔ باقی سلسلوں میں مبتدی کو ذکرِ لسانی جہری کرایا جاتا ہے۔ ذکرِ جہر جسے حنفیہ کے فتاویٰ شامی میں بدعت کہا گیا ہے وہ کسی سلسلے کے کسی محقق نے کبھی نہیں کرایا اور جو جہر بدعت نہیں وہی کراتے ہیں اس کے لیے بھی چند شرائط ہیں۔ اوّل جہر مفرط نہ ہو زیادہ سے زیادہ جہر متوسط ہو۔ دوم اس جہر سے کسی کی نیند آرام یا عبادت میں خلل نہ آئے اگر کسی مبتدی کی پراگندہ خیالی جہر متوسطہ سے دُور نہ ہو یا اسے یکسوئی حاصل نہ ہو سکے تو اسے آبادی سے دُور بھیج دیتے ہیں کہ وہاں جا کر تدبیر کی حد تک اتنی اُونچی آواز سے ذکر کرے۔ کہ خیالات کی پراگندگی

دُور ہو جائے۔

ذکرِ الٰہی یا تو نفی اثبات کا کرایا جاتا ہے یا اسمِ ذات کا پھر نفی اثبات میں بھی ذکر کے چار درجے رکھے اوّل ذکر ناسوتی یعنی لا الٰہ الا اللہ دُوسرا ذکرِ ملکوتی الا اللہ تیسرا ذکر جبروتی اللہ چوتھا لاہوتی یعنی ھُوھُو نقشبندیہ میں زیادہ تر ذکر اسمِ ذات ہی کرایا جاتا ہے باقی سلسلوں میں بھی ذکرِ جہر صرف مبتدی کے لیے ہوتا ہے۔ بعد میں سب ذکرِ خفی کراتے ہیں کیونکہ اصل ذکر تو ذکرِ خفی قلبی ہے۔ اس کی فضیلت حدیثوں میں بیان ہوئی ہے۔ سب لطائف جاری ہو گئے تو گویا رُوح میں وہ قوت پیدا ہو گئی کہ ایک طرف جسم کے اعمال کو صحیح سمت پر لگا دے۔ دوسرا اس میں قوتِ پرواز پیدا ہو گئی کہ اپنے وطنِ اصل کی طرف سرگرم سفر ہو سکے۔ اور لطیفۂ قالبیہ میں یہ استعداد پیدا ہو گئی جسم اور اس کے اعضاء رُوح کی اس باطنی قوت کے بل بوتے پر اور اس کی راہنمائی میں صحیح رُخ پر حرکت کرنے لگیں۔ یعنی فکر صحیح ہو گئی۔ سوچ دُرست ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ پر یقین پختہ ہو گیا۔ اخلاق سنور گئے۔ معاملات میں کھرا پن آ گیا۔ یعنی انسان صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا۔

ساتوں لطائف پر باری باری توجہ کر کے ذکرِ الٰہی کرنے کے بعد پھر لطیفۂ قلب پر توجہ کر کے ذکرِ الٰہی کرایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سب ظاہری اور باطنی خوبیوں کا اصل مرکز یہ قلب ہی تو ہے جس کے متعلق ارشادِ نبویؐ ہے۔ کہ یہ درست ہوا تو سارا نظام دُرست ہو گیا۔ اور یہ بگڑا تو سارا نظام بگڑ گیا۔ اصل سرچشمہ یہی ہے جس سے فکر و عمل کے سوتے پھُوٹتے ہیں ساری روحانی قوت کا ذخیرہ اسی میں رکھا جاتا ہے۔ تمام سسٹم

اسی میں بھری جاتی ہے۔ ایک طرف تو یہ سارے سبق کا اعادہ ہے دوسری طرف اس حقیقت کو ازبر کرنا کہ ساری کوشش اس کے سنوارنے میں صرف کرنی ہے اس کا عکس باقی سارے لطائف پر پڑتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ؎

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است
وز ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

یار لوگوں نے اسے عمل سے جی چرانے کا بہانہ بنا لیا ہے حالانکہ دل سے مراد دلِ خود ہے یعنی اپنے دل پر اپنے جذبات پر اپنے ارادوں پر اپنی خواہشات پر قابو پانا سیکھو اس پر کنٹرول کرنے کا سلیقہ اپناؤ۔ ورنہ دل میں آوارگی کے جذبات ہیں۔ ارادے متزلزل ہیں خواہشات میں سفلی رجحان ہیں تو اس غلیظ دل کو لے کر کعبہ بھی جاؤ گے تو کون سی دولت سمیٹ کے لاؤ گے گندے برتن میں تو کوئی پانی ڈال کر پینا بھی گوارا نہیں کرتا کعبہ جا کر کعبہ والے کی محبت کے لیے پہلے اپنے دل کا ظرف تو اس قابل بنا لو۔ اس کا رُخ تو سیدھا کر لو۔ اگر اس کا رُخ غیر کی طرف رہا تو یہ جسم کو کب اللہ کی طرف اللہ کی رضا کی طرف، اللہ کے قرب کی طرف اللہ کی محبت کی طرف قدم اٹھانے پر آمادہ کر سکے گا۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جُھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

آپ کہیں گے کہ لوگ لطائف چھوڑ۔ سلوک کے اونچے مقامات پر پہنچ جانے کے مدعی ہوتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی اس کی شہادت نہیں دیتی بلکہ ان کے عمل کو لوگ ہدفِ ملامت بناتے ہیں۔ اور تصوف و سلوک پر

پھبتیاں کستے ہیں۔ اسے رہبانیت قرار دیتے ہیں۔ بے عملی کا طعنہ دیتے ہیں معاشرے کے لیے ایک بوجھ خیال کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے ؟

تو اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ دعویٰ اور حقیقت میں فاصلہ ہوتا ہے۔ ہر دعویٰ زبان سے نکلتے ہی حقیقت نہیں بن جایا کرتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ چیز جتنی قیمتی ہو اسی مناسبت سے اس کی نقالی بھی ہوتی ہے۔ جعل ساز حرکت میں آ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جعلی کرنسی تیار ہو جاتی ہے مگر جعل ساز نقلی پیسے نہیں بنایا کرتے وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہزار کا نوٹ بنے یا کم از کم پانچ سو کا تو ضرور بنے۔ وہ لاکھ کوشش کریں آخر پکڑے جاتے ہیں یا کم از کم جعلی نوٹ تو پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان جعلسازوں کی وجہ سے اگر کوئی اصل کرنسی کا ہی انکار کر بیٹھے تو ذرا ایسا کرکے دیکھے۔ اس کی زندگی کی ضرورتیں کیونکر پوری ہوتی ہیں۔

پھر دیکھئے کتنے عطائی اور مجمع باز شہروں اور بستیوں میں مجمع لگائے دکھائی دیتے ہیں دوائیں بیچ رہے ہیں۔ آنکھوں کے آپریشن کرتے پھرتے ہیں۔ سادہ لوح مخلوق ان کی چرب زبانی کی وجہ سے دھوکا کھا جاتی ہے مگر انہیں دیکھ کر کوئی شخص فنِ طب اور میڈیکل سائنس کی افادیت کا انکار کر دے تو اُسے کون عقلمند کہے گا۔ اس لیے نقل کو دیکھ کر اصل سے دل برداشتہ ہو جانا بھلا کہاں کی دانشمندی ہے۔

اصل کے نمونے دیکھنا چاہو تو تاریخ کے اوراق جھانک کر دیکھو، ان لوگوں کی زندگی کا ایک پہلو، دعوت و تبلیغ ہی دیکھو اور یہ پہلو انسانیت کی اصل خیرخواہی اور حقیقی خدمت ہے۔ اپنے ملک کے حالات

پڑھیئے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ شیخ اسماعیل لاہوریؒ ۱۰۰۵ء میں لاہور میں آئے۔ ان کی دعوت سے ہر روز سینکڑوں آدمی اسلام قبول کرتے تھے۔

۲۔ سیّد علی ہجویریؒ ۱۰۷۲ء غزنوی دَور میں دعوتِ تبلیغ کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر آئے۔ اور لاہور میں دینِ حق پھیلایا۔

۳۔ خواجہ معین الدّین چشتیؒ ۱۲۳۷ء کے حالات دیکھیئے صرف ایک سفر میں دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے ۷۰۰ ہندو ان کے ہاتھ پر اسلام لائے۔

۴۔ بوعلی قلندرؒ ۱۳۲۴ء۔ پانی پت کے راجپوتوں کو مسلمان کیا۔

۵۔ بہاء الدّین زکریا ملتانی ۱۱۸۵ء ملتان کے مضافات کو نورِ اسلام سے منوّر کیا۔

۶۔ سیّد جلال بخاریؒ ۶۴۲ھ اوچ میں آئے جھنگ شہر آباد کیا۔ راجپوتوں کے کئی قبیلوں کو مسلمان کیا۔

۷۔ سیّد جمال الدّینؒ بخارا کے تھے کاشغر کا بادشاہ تیمور خاندان ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔

۸۔ سیّد جلال الدّین تبریزیؒ نے ۱۲۴۴ء۔ بنگال میں اسلام پھیلایا۔

پندرھویں صدی میں سوڈان میں سلسلہ قادریہ کے بزرگوں نے اسلام پھیلایا،
سندھ میں سیّد یوسف الدّین نے دس برس میں ۷۰۰ خاندان مسلمان کئے۔
یہ فہرست بڑی طویل ہے۔ شوق ہو تو آرنلڈ کی "پریچنگ آف اسلام" کا مطالعہ کیجئے۔

اپنے ملک میں خاندان ولی اللہ کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔ علمی خدمات کے علاوہ اربابِ اقتدار کے ہاتھوں جو مصائب دیکھے ان کا انکار کوئی کیسے

کر سکتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات پڑھیئے، کسی راہب یا تارکِ دُنیا کو کوئی حکمران بھلا قید و بند کا تحفہ دیتا ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر کو آخر ایک "راہب" کے آگے جھک جانے کی کیا مجبوری تھی۔ کوئی کہاں تک شمار کرے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنے کا سلیقہ سیکھیئے اور نقل سے دھوکا کھا کر اصل کا انکار کر دینے کی جرأت نہ کیجئے۔

حقیقی تصوّف و سلوک کا خاصہ ہے کہ انسان کو صحیح معنوں میں عملی انسان بنا دیتا ہے۔ وہ اللہ کا بندہ اور مخلوق کا خادم بن کر اللہ کی زمین پر زندگی کے دن گزارتا ہے ؎

سعادت رُوح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں
کہ کالج میں کوئی اِس علم کا ماہر نہیں ہوتا

مجلسِ ذِکر (۹)

تصوّف و سلوک کی تعلیم و تربیت کے بُنیادی اسباق یعنی لطائف کا تفصیلی بیان ہو چکا۔ اور یہ واضح ہو چکا کہ لطائف کے منوّر ہونے یا جاری ہونے یا راسخ ہونے سے سالک کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ قلب کو تعلق مع اللہ پیدا ہونے سے اور اس کے اندر اتباعِ سُنّت کا جذبہ کامل پیدا ہونے سے اس کے شخصی حالات اس کے اخلاق اور معاشرے میں رہ کر دُوسروں سے اس کے معاملات پر کیا اثر پڑتا ہے۔

اس کا نصب العین آخرت کی فوز و فلاح بن جاتا ہے اور اس کے حصُول کے لیے دنیا اور سامانِ دُنیا جو ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی قدر و قیمت اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر مخلوق کی خیر خواہی کا جذبہ اس حد تک پیدا ہو جاتا ہے کہ مخلوق کو ایذا دینا تو ایک طرف مخلوق کے ایذا کے تصوّر سے بھی اس کی رُوح کانپتی ہے۔ لہٰذا اس تفصیل سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سماجی بُرائیوں کے قلع قمع کے لیے جو احساس پیدا ہو رہا ہے جو تحریکیں چل رہی ہیں اور "معاشرتی بُرائیوں کی اصلاح" کے نام سے محکمے کھڑے کرکے جو قوّت، وقت اور مال کی قربانی کی جا رہی ہے۔ اگر اس کی جگہ اُمّتِ مسلمہ کے افراد کو تصوّف و سلوک میں تربیت دے کر یہ لطائف ہی کرا دیئے جائیں تو تمام

سماجی بُرائیوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے اور انسانیت کو سُکھ کا سانس لینا نصیب ہو سکتا ہے۔

لطائف کے بعد مراقبات کی تربیت کی جاتی ہے اور مراقبات ثلاثہ یکے بعد دیگرے کرائے جاتے ہیں۔

مراقبہ کے لفظی معنی انتظار، نگہبانی اور حفاظت کے ہیں۔ یعنی سالک پُورے حضورِ قلب سے اِس بات کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت، رحمت، فیض اور انوار اس کے قلب میں جاگزیں ہونے لگیں اس کے لیے پوری طرح متوجہ اور یکسو ہونا لازمی ہے۔ تاکہ اس کا قلب منبع ہدایت اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے لیے بن جائے اور اللہ کی رحمت سے اس کا وجُود اور اس کی ذات مخلوق کے لیے رحمت بن جائے اور توفیقِ الٰہی سے فیضِ یزدانی اور انوارِ رحمانی اس کے ظاہر و باطن کو سنوار دیں۔

نگہبانی اس بات کی کہ کوئی جذبہ اور خیال اس کی توجہ کو اللہ کی طرف سے نہ ہٹا سکے اور حفاظت اس دولت کی جو لطائف کی صُورت میں حاصل ہو چکی ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی نگہداشت اور حفاظت ہونے لگتی ہے وہ شیاطین الانس والجن سے اس کی حفاظت فرماتا ہے۔

اصطلاحِ تصوّف میں مراقبہ کی حقیقت مولانا تھانویؒ کے الفاظ بں یہ ہے۔

"کسی مضمون کا دل سے اکثر احوال میں یا ایک محدود

وقت تک اس غرض سے کہ اُس کے غلبہ سے اُس
کے مقتضی پر عمل ہونے لگے۔ تصوّر رکھنا مراقبہ کہلاتا
ہے۔ جو اعمال مقصُودہ قلب میں سے ہے۔"
اس حدیث میں اس کا امر ہے۔
عن ابنِ عمر قال اخذ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ
وسلّم بمنکبی و قال کن فی الدنیا کانك غریب او
عابر سبیل اخرجه البخاری و الترمذی زاد وعد
نفسك من اهل القبُور۔
یعنی ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم
نے میرا کندھا پکڑ کر ارشاد فرمایا۔ دُنیا میں اس طرح رہ
گویا تو مُسافر ہے بلکہ گویا راہ میں گزر رہا ہے .....
اور اپنے کو اہلِ قبور میں شمار کر۔
"اہلِ قبور میں اپنے آپ کو شمار کرنا عمل قلب ہے۔
اور اس پر اثر جو مرتّب ہوتا ہے وہ محبّت دُنیا کو
کم کر دیتا ہے اور اِنقیاد وتفویض کا غالب ہوجاتا ہے۔"
التکشف میں ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔
"ذات و صفات حق تعالیٰ یا کسی مضمون خاص کی
طرف تدبّرِ تام سے متوجہ ہونا اور اس کا تصوّر قلب میں
مواظبت کے ساتھ جمانا مراقبہ کہلاتا ہے۔"
یہ حقیقت ایک حدیث سے مستفاد ہوتی ہے۔
عن ابنِ عباس قال قال ابوبکر یا رسول اللّٰہ

قد شبت۔ قال شیبتنی ھود والواقعة اخرجه الترمذی۔

"یعنی حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ تو بُوڑھے ہو گئے۔ فرمایا مجھے سورۂ ھُود اور سورۂ واقعہ نے بوڑھا کر دیا۔"

"ظاہر ہے کہ یہ اثر خشیت کا کہ جوان سے بوڑھا کر دے موقوف ہے تفکر دائم اور توجہ قوی پر، پس حدیث سے عمل مراقبہ کا اثبات ظاہر ہوتا ہے۔"

مراقبہ کی اصطلاح کی حقیقت معلوم کر لینے کے بعد ہم اپنے پہلے سبق یعنی "مراقبہ احدیت" کی طرف آتے ہیں۔ اس مراقبہ کے وقت اور اس کے دوران زبانِ قلب یا زبانِ ظاہر سے چند الفاظ کہے جاتے ہیں۔ پہلا ہے "فیض اللہ" یعنی اللہ جل جلالہ کی طرف سے فیض کے آنے کے انتظار میں بیٹھ گیا ہوں مگر ہر لین دین میں دونوں طرف کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے اور دونوں طرف کسی قسم کی احتیاج پائی جاتی ہے تو سالک کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے مگر کیا دینے والے کو بھی کوئی احتیاج ہے تو دُوسرا لفظ "منزہ" یعنی وہ تو ہر قسم کی احتیاج ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے۔ مگر وہ دینے والا ہے کون؟ ذرا دیکھ تو لوں۔ تو تیسرا لفظ ہوتا ہے۔ "بے چون و چگون"۔ یعنی تم اسے کیا دیکھو گے وہ تو ایسی ذات ہے کہ اس کی کوئی مثال بھی تصور میں نہیں آ سکتی اس لیے پیکر تراشی کا خیال بھی نہ کرو۔ درست! مگر جب وہ ایسا ہے تو میرا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے

پھر الفاظ آتے ہیں وَ اِلٰھُکُمْ کہ وہ معبود ہے اور تو عبد ہے اور معبُود اس لیے ہے کہ عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔ اور تیرا معبُود نہیں سب کا معبوُد ہے۔ مگر دیکھنا انسان عبادت کے رشتے جوڑنے میں دھوکا بھی کھا جاتا ہے اس لیے کہنا اِلٰہٌ وَاحِدٌ۔ کہ معبوُد صرف وہی ہے اور کوئی معبود نہیں۔جب یہ بات سمجھ چکے کہ صرف وہی ایک معبوُد ہے تو کہو وحدہٗ۔اب تک تم غائبانہ باتیں کرتے رہے لو اب تم اپنے معبوُد کو مخاطب کرکے براہِ راست اس سے کلام کرو۔

کانك تراہ

جیسے کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ اور کہو

لاشریك لك یا اللہ

کہ اے میرے اللہ تیرا کوئی شریک نہیں۔یہاں تم نے لاشریك لك فی العبادۃ نہیں کہا بلکہ مطلق لاشریك لك کہا تو تمہیں یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ عبادت میں کوئی تیرا شریک نہیں۔ تخلیقِ کائنات میں تو لاشریک ہے۔ تزلیق کائنات میں کوئی تیرا ساجھی نہیں تدبیرِ کائنات میں کسی کے مشورے کا محتاج نہیں اب اس تصوّر میں گم ہو جاؤ تاکہ اس کے مقتضی پر عمل ہونے لگے۔

اس کا مقتضی کیا ہے ؟ یہی کہ میری عملی زندگی میں عبادت صرف تیری ہو گی یعنی صرف تیری بات مانوں گا۔ یا اس کی بات مانوں گا۔ جو تیری بات کہے۔کیونکہ بات تو تیری ہو گی وہ تو صرف

پہنچانے والا ہو گا۔ پہنچانے والے کا شکر گزار ہوں گا۔ کیونکہ اس نے تیری بات پہنچائی۔ اور مجھ نالائق کو پہنچائی۔ اس کا احسان مانوں گا۔

پھر تخلیق میں جب تو لاشریک ہے تو جسے تو چاہے پیدا کرے کون اس میں دخل دینے والا ہے تُو نے بتا دیا۔

یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ یَهَبُ لِمَنْ یَشَاءُ اِنَاثًا وَیَهَبُ لِمَنْ یَشَاءُ الذُّکُوْرَ اَوْیُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَاِنَاثًا وَیَجْعَلُ مَنْ یَشَاءُ عَقِیْمًا۔ (۴۲: ۵۰)

یعنی تو جو چاہے دیتا ہے چاہے بچی دے چاہے کسی کو بچہ دے چاہے جڑواں دے دے چاہے کسی کو بانجھ کر دے جب تخلیق میں تیرا کوئی شریک نہیں تو اس پہلو پہ تیرا جو فیصلہ ہو میں اس پر راضی ہوں خوش ہُوں۔ مطمئن ہوں۔

پھر جب رزق دینا تیرا ہی کام ہے اور تیرا اعلان ہے۔

یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَشَاءُ وَیَقْدِرُ

چاہے تو کسی کو فراوانی سے دے چاہے تو اپنے اندازے کے مطابق کسی کی تمنّا سے کم دے۔ تو پھر میں تیری تقسیم پر مطمئن ہوں۔

یہ اطمینان مجھے زر پرستی سے۔ رشوت اور دھوکے سے غبن اور فریب کاری سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ مَیں ان میں سے نہیں ہوں گا۔ جو یہ کہنے لگیں۔

یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَا اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ۔ (۲۸: ۷۹)

کاش مجھے بھی اتنا کچھ ملتا جو قدیم و جدید قارونوں کو تُو نے دے رکھا ہے بلکہ مَیں تو کہوں گا۔

ثواب اللہ خیر لمن اٰمن وعمل صالحا۔ (۲۸: ۸۰)
یہ دولت کیا کم ہے جو تُونے مجھے اپنا بنا رکھا ہے۔
پھر اس کا مقتضی یہ ہے۔ کہ جب میں نے تسلیم کر لیا کہ تدبیرِ کائنات میں تو لاشریک ہے تو میں تیرے فیصلوں پر جز بز کیوں ہونے لگا۔ سُکھ میں تیرا شکر کروں گا۔ کہ مجھے بلا استحقاق ملا۔ اور دُکھ میں صبر کروں گا۔ کہ تُو اس سے بڑی مصیبت دینے پر بھی قادر تھا مگر اپنی رحمت سے میری بھلائی کے لیے میری ناتوانی دیکھ کر یہ چھوٹی مصیبت دکھائی۔ میں جانتا ہوں۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللہِ۔ وَمَنْ یُؤْمِنْ بِاللہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ۔ (۶۴: ۱۱)

یعنی مصیبت اس کے حکم سے آتی ہے اور مصیبت میں دل کو ٹھکانے پر رکھنا بھی اسی کی عنایت سے ہوتا ہے۔

غم چو بینی زود استغفار کن
غم بامر خالق آید ۔ کار کن

جب غم تُو نے دیا تو میں اسے محبوب کا تحفہ سمجھ کر کہہ دوں گا

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدرت را می شناسم

اجمالی طور پر اس مراقبے کا مقتضی یہ ہے۔ اس مراقبہ کے راسخ ہونے کا اثر سالک کے اعمال پر یہ ہونا چاہیئے کہ ہر حال میں زبانِ حال سے کہتا رہے کہ لا نافع الا اللہ۔ لاضار الا اللہ انت مقصودی و رضاك مطلوبی۔

مقصد یہ ہے کہ ذہنی عمل یہ مراقبہ رفتہ رفتہ حال بن جائے کسی حقیقت کا علم ہونا اور چیز ہے اور اس حقیقت کا حال بن جانا اور بات ہے۔ اور یہی مطلوب ہے۔

یہ دُکھ اور مصیبت کا معاملہ ذرا کٹھن ہے اس میں اُمورِ طبعی کے پیشِ نظر کچھ ہدایتیں ہیں کچھ رعایتیں ہیں مثلاً مصیبت آئے تو اظہارِ رنج چار صورتوں میں ہوتا ہے۔ اوّل دل میں غم کا احساس ہوتا ہے۔ دوم آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ یہ دونوں طبعی ہیں اور غیراختیاری ہیں۔ اِس لیے ان پر مواخذہ نہیں اور یہ کسی درجے میں مذموم نہیں اس لیے اس صورت میں آدمی معذور تصور ہوتا ہے۔ مگر دو صورتیں اختیاری ہیں یعنی زبان سے گلہ شکوہ۔ بین نوحہ کرنا اور ہاتھوں سے گریبان پھاڑنا۔ سینہ کوبی کرنا وغیرہ یہ دونوں اختیاری ہیں اس لیے قابلِ مواخذہ ہیں مذموم ہیں ناجائز ہیں اور یہ تو اللہ کے فیصلے کے خلاف احتجاج ہے سٹرائیک ہے اس لیے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نوحہ کرنے والوں اور والیوں کے لیے سخت وعید سنائی ہے۔ کیوں نہ ہو جو بندہ ہو کر مالک کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرے خالق کے نزدیک اس سے زیادہ ناپسندیدہ کون ہو سکتا ہے۔

اس کے برعکس حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایسے حالات کے لیے ایک مراقبہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

لا تقل لوانی فعلت کذا لکان کذا ولکن قل ماشاء اللہ کان ومالم یشاء لم یکن اوکما قال۔

یعنی جب کوئی ناساعد حالات پیش آ جائیں تو یہ نہ کہو کہ میری

تدبیر غلط ہو گئی اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف تدبیر اور سبب کو مؤثر سمجھتے ہو اور مسبّب اور مدبّر کا خیال تک نہیں بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے جو چاہا وہ ہو گیا۔ اور جو اس نے نہیں چاہا نہیں ہوا۔ پہلا اصول تجویز ہے دوسرا اصول تفویض ہے اور اصول تجویز کا ماحصل پریشانی کے سوا کچھ نہیں اور اصولِ تفویض کا نتیجہ سراسر اطمینان اور سکون ہے۔

یہ ذہنی عمل اور یہ مراقبہ جب حال بن جائے۔ تو صورت عجیب بن جاتی ہے۔ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے لیے یہ حقیقتِ حال بن چکی تھی کہ مصیبت کو بھی رحمت محسوس کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بیمار تڑپتا ہوا آیا کہ حضرت دُعا کریں سخت تکلیف میں ہوں شاگرد سوچ میں پڑ گئے کہ دیکھئے حضرت کیسے دُعا کرتے ہیں۔ جب ان کے نزدیک بیماری بھی رحمت ہے تو صحت کی دُعا کرنے کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ رحمت کے چھن جانے کی دُعا کریں گے۔ اور نہیں کرتے تو ایک مصیبت زدہ کی دلجوئی کی صورت کیا ہو گی۔ آپ نے ہاتھ اُٹھائے اور دُعا شروع کی۔ الٰہی! بیماری بھی رحمت ہے، صحت بھی رحمت ہے۔ ہر آدمی ہر قسم کی رحمت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ کمزور ہے اس کے حق میں بیماری کی رحمت کو صحت کی رحمت سے بدل دے تو قادر ہے۔

دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مراقبۂ احدیت کی حقیقت کو ہمارا حال بنا دے

مراقبۂ معیت

مراقبات میں یہ دوسرا سبق ہے اس مراقبہ میں یہ الفاظ اور ان کے معنی پر غور کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب میں فیوض و انوار کا انتظار کیا جاتا ہے۔ پہلا جملہ ہے "اللہ حاضری" یعنی اللہ میرے سامنے موجود ہے۔ جب اتنی بڑی اور بے نیاز ذات موجُود ہے تو اسے چھوڑ کر کسی اور طرف توجّہ کیوں کروں اور کیسے کروں، دوسرا جملہ ہے "اللہ ناظری" یعنی اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب وہ سامنے ہے اور مجھے دیکھ بھی رہا ہے تو اس کے سامنے میری حالت میرے ظاہر و باطن کی حالت کیسی ہونی چاہیئے۔ لازمًا ایسی کہ اسے ناپسند نہ ہو، ہیئت ظاہری ناپسندیدہ نہ ہو۔ عقیدت ادب کا اظہار ہو اور باطن کی حالت یہ ہو کہ دل میں خشوع و خضوع ہو۔ دل میں کوئی ایسا خیال نہ آنے پائے۔ جو اسے ناپسند ہو۔ وہ تو علیم بذاتِ الصّدور ہے صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا۔ میرا باطن بھی اس کے سامنے ہے۔ تیسرا جملہ ہے "اللّٰه مَعِیْ"۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔ بندے کو رب کی معیت حاصل ہو جائے۔ تو اس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ یہاں تک تو سائل کا خیال اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے اور ایک خاص حالت اور ایک مقام سے متعلق جہاں سالک بیٹھا ہے۔ اِس سے اِس لغزش کا امکان ہے کہ وہ اور کہیں نہیں بلکہ یہیں ہے اور کسی کے ساتھ نہیں صرف میرے ساتھ ہے تو اس ٹھوکر سے بچنے کے لیے چوتھا جُملہ ہوتا ہے۔

وھو معکم اینما کنتم۔ یعنی مخلوق جہاں کہیں بھی ہے جس حالت میں ہے جو بھی ہے اللہ اس کے ساتھ ہے اور اس کا احساس کہیں علمی ہے کہیں عقلی ہے کہیں حالی ہے مگر ہے بلاکیف کہ اس معیت کی حقیقت بیان میں نہیں آ سکتی۔

انسان کو کسی کی معیت کا احساس دو موقعوں پر ہوتا ہے۔ اوّل خوف کی حالت میں۔ تو جب انسان کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے خواہ اپنی ذات کے لیے خطرہ کا احساس ہو۔ خواہ اپنے متعلقین کے لیے۔ تو اسے کسی معاون کسی مددگار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سالک کا یہ مراقبہ جب راسخ ہو جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ اللہ میرے ساتھ ہے۔ میرا معاون ہے اور اس سے قوی تر معاون اور کون ہے دشمن خواہ کتنا قوی ہو۔ آخر مخلوق ہے اور خالق کے مقابلے میں مخلوق کی حیثیت ہی کیا ہے۔ قرآن کریم میں ایسے مواقع کی کئی مثالیں بیان ہوئی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اپنے بھائی کو ساتھ لے کر جب فرعون کو دعوت الی اللہ دینے کے لیے جانے کا حکم ہوا۔ تو آپ کو اندیشہ ہوا کہ وہ تو میری جان کا لاگو ہے سامنے ہوتے ہی مجھے قتل کرا دے گا تو اللہ کا پیغام کیسے پہنچاؤں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی اور فرمایا۔

لا تخافا تم دونوں مت ڈرو تمہاری حفاظت کرنا میرا کام ہے۔

اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی۔ (۲۰: ۴۶)

میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری دعوت کے الفاظ سُن رہا ہوں گا اور اس منظر کو دیکھ رہا ہوں گا۔ پھر ڈر کیسا۔ اسی معیت باری کا یہ اثر تھا کہ حضرت موسیٰؑ نے نہایت جرأت اور اطمینان سے نہ صرف دعوت کا پیغام پہنچایا بلکہ فرعون کی آنکھ سے آنکھ ملا کر خوب سوال و جواب ہوئے۔ یعنی معیت باری کا احساس انسان کو جری بنا دیتا ہے۔ اندیشہ ہائے دور دراز بالکل کافور ہو جاتے ہیں اور کیفیت کچھ یوں ہو جاتی ہے کہ ؎

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہوا ہے کیا خوش مزاج ہے

دوسرا موقع وہ ہے جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے حضرت ابوبکرؓ کو بحکمِ الٰہی ساتھ لے کر مکہ سے چلے اور غارِ ثور میں جا قیام کیا۔ اِدھر قریش بھی کھوج لگا کر غار تک پہنچ گئے۔ صدیقِ اکبرؓ نے دشمن کے پاؤں کی آہٹ ہی نہ سُنی بلکہ وہ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ان کی باہمی گفتگو سُنائی دے رہی تھی آپ کو اندیشہ ہوا کہ اِس متاعِ دوجہاں کو یہ ظالم کوئی گزند نہ پہنچائیں۔ تو عرشِ الٰہی سے تسلی کے الفاظ نازل ہوئے۔ اور جس کے متعلق خوف تھا۔ اسی کی زبانِ حق ترجمان سے سُنا۔ کہ

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔

تو غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ معیت باری کا مژدہ سُنا تو کیفیت بدل گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی خطرہ سرے سے موجود ہی نہیں۔

یہ مراقبہ سالک میں ایسی اسپرٹ بھر دیتا ہے کہ خطرات میں اس کے دل کی دُنیا میں کوئی مدو جزر نہیں آتا۔ آج جنگی مہموں میں اور عین جنگ میں انتہائی کوشش کی جاتی ہے کہ سپاہیوں کا مورال بُلند رہے۔ کاش کوئی سوچے کہ ایک ہزار کے مقابلے میں ۳۱۳ کا مورال بلند رکھنے والی کونسی تدبیر تھی اس کے سوا کسی اور تدبیر کا سُراغ نہیں ملتا کہ انہیں یقین تھا کہ

هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ

صرف یقین نہیں بلکہ یہ حقیقت ان کے لیے حال بن چکی تھی۔

کسی کی معیت کے احساس کا ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک اور موقعہ ہوتا ہے اور وہ ہے لالچ، دُنیا کا لالچ۔گناہ کی خواہش لذت پرستی کا شکار ہو جانے کا موقع ہے۔سالک کو جب معیت باری کا احساس ہو تو رشوت لیتے وقت یہ احساس اس کا ہاتھ روک لے گا۔ بُرائی کا ارادہ کرتے وقت اسے شرم محسوس ہونے لگے گی۔کہ مالک میرے ساتھ ہے، موجُود ہے، دیکھ رہا ہے پھر اس ڈھٹائی کی جرأت کیسے؟ اس ایک ہی مراقبہ سے نہ صرف شخصی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ تمام سماجی بُرائیوں کا قلع قمع بھی ہو جاتا ہے۔ آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ گناہ یا جُرم اس وقت کرتا ہے جب اُسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ کسی کو کوئی خبر نہیں، کوئی دیکھ نہیں رہا۔ مگر جب اس کا یقین جم چکا ہو کہ اللہ موجود ہے۔ دیکھ رہا ہے، میرے ساتھ ہے تو اتنا جری صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے اندر کا انسان مر چکا ہو یا مخبوط الحواس ہو کہ پھر بھی

گناہ یا جُرم کا ارتکاب کر ہی لے۔

اس تفصیل سے واضح ہو چکا ہو گا کہ سالک جب یہ مراقبہ کر لے تو اس کے اندر اور اس کے اعمال میں کیا تبدیلی آ جانی چاہیئے اس طریقے سے وہ خود معلوم کر لے گا۔ کہ قربِ الہٰی کی طرف میں کتنے قدم بڑھا ہوں۔ میرا یہ مقام پختہ ہُوا ہے یا نہیں۔ کسی سے یہ پُوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ کہ ذرا اپنی بصیرت سے یہ دیکھ کر بتائیں کہ میری رُوح کی پرواز کہاں تک ہے۔ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کر سکے گا۔ کہ ذکر کی برکت سے شیخ کی وجہ سے جو سٹیم میرے باطن میں بھری گئی ہے اس نے عملی زندگی کے انجن کو منزل کی طرف چلایا ہے یا نہیں اگر انجن چل پڑا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اس رفتار کو قائم رکھنے کی کوشش کرے اور اگر ابھی تک یہ حقیقت صرف ایک علم یا ایک فلسفہ کی حد تک ہی محدود ہے تو کوشش کرے یہ حال بن جائے اور اس کی عملی زندگی بلکہ ہر حرکت یہ ظاہر کرے کہ اسے اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور اس کی معیت کے یقین کی دولت حاصل ہو گئی ہے۔

مراقبہ اقربیت

یہ تیسرا مراقبہ ہے۔ قریب اور اقرب میں فرق ہے جو چیز سب سے زیادہ قریب ہو اسے اقرب کہتے ہیں۔ گویا یہ قرب کا انتہائی درجہ ہے۔ اس مراقبہ کے دوران یہ وظیفہ پڑھا جاتا ہے کہ

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم بندے سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرب بندہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ذاتِ وراء الورا ہے بندہ اس تک کیسے پہنچے۔ مگر وہ ذات اپنی رحمت سے بندہ کے قریب ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ قریب ہی نہیں اقرب ہے۔ بندہ کو قریب و بعید کا احساس ہی جان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک جسم بے جان کو کسی کے قُرب و بُعد کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ گویا قرب کا احساس دینے والی چیز ہی بندہ کے سب سے زیادہ قریب ہے مگر وہ تو فرماتا ہے کہ مَیں رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ اس قُرب کا تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے آپ ایک لفافہ لے کر اس پر ٹکٹ چسپاں کرتے ہیں پہلے وہ ٹکٹ کہیں دُور پڑا تھا اب لفافے پر چسپاں ہو گیا ظاہر ہے کہ اب وہ لفافے کے قریب ہی نہیں بلکہ اقرب ہے۔

مگر سوچئے ایک چیز ایسی بھی ہے جو اس ٹکٹ کی نسبت بھی لفافے کے زیادہ قریب ہے اور وہ ہے گوند جس نے ٹکٹ کو لفافے پر چسپاں کیا گو بظاہر ٹکٹ ہی اقرب ہے اس طرح رگِ جاں انسان کے زیادہ قریب ہے مگر درحقیقت وہ ذات جس نے رگِ جاں میں جان ڈالی وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔

قرب کی حقیقت پر مولانا تھانویؒ کے الفاظ سُنئے۔

"قرب کے مختلف درجات ہیں ایک تو قربِ حقیقی ہے جس کا ترجمہ مل جانے سے کر لو یا ادراکِ حقیقت سے ہو قربِ حقیقی تو کسی

کو حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ جسم اور مکان سے پاک ہے اور ادراکِ حقیقت بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک احاطہ کو چاہتا ہے۔ ممکن بھلا واجب کا ادراک کیونکر کر سکے لہٰذا اقرب سے مُراد قربِ حقیقی تو نہیں۔

"دُوسرا ہے قربِ مجازی جس کا حاصل حجابات کا اُٹھ جانا یا کم ہو جانا ہے ایک تو قربِ علمی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔"

"ایک ہے قربِ تعلق خصُوصیت۔ جیسے ہم کہتے ہیں تم دُور رہ کر بھی پاس ہو۔ یعنی تم سے ہمارے دل کا خاص تعلق ہے ..... قرآن مجید ہے جو قرب مطلوب اور جسے اولئك المقربون میں انسانیت کا بلند ترین مقام قرار دیا گیا ہے وہ کمال ایمان اور کمال دین ہی کا نام ہو سکتا ہے۔ اسی کا قرآنی نام قرب ہے ..... یعنی کمال دین جب وہ امرِ طبعی کا سا حال بن جائے۔ کہ دینی زندگی اور دینی احکام کی اطاعت طبیعت بن جائے اور زندگی کی ہر حرکت و سکون میں وہی بات بالطبع پسند ہو اور کرنے کو جی چاہے۔ جو خدا تعالیٰ کو اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پسند ہو، اور اس میں اس کی رضا ہو۔ تو اصل مقصود رضا ہے۔ جو وصول یا قربِ حق تعالیٰ کی رضا کے ساتھ نہ ہو۔ وہ مقصود نہیں۔"

"وصول کی صورت یہ ہے کہ ابتداء میں تو سالک

ہیں اور محبوبِ حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جسے
سالک طے نہیں کر سکتا مگر جب یہ چلنا شروع کر دیتا
ہے۔ تو حق تعالیٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ
اتنی لمبی مسافت ان سے قطع نہ ہو گی۔ اب وہ خود
چلنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کو اس مسافت کا طے
کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آ جاتے
ہیں پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ
خود اس کے پاس آ جاتے ہیں۔"

(اور مژدہ سناتے ہیں۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید)
"یہی صورت سالک کے باطن کی ہے کہ اوّل تم اپنی
ناتمام سعی اور طلب ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہرگز وصول
کے قابل نہیں تھی مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو
اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت کو جوش آتا ہے اور خود
آ کر گلے لگا لیتے ہیں (جیسے شیرخوار بچّہ چلنا شروع کرتا
ہے گر پڑتا ہے آپ دوڑ کر اسے اٹھا لیتے ہیں) اس
لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بچّہ کی طرح ایک دو
قدم چل کر رونا تو شروع کرو۔

یہ حق تعالیٰ کا اقرب ہونا اور یہ بتانا کہ مَیں اقرب ہوں محض
ایک شغل نہیں بلکہ ایک حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ مَیں وُہ ہوں
جس نے حبل الورید میں جان ڈالی، تمہاری نشو و نما کی تمہیں طرح طرح
کی صلاحیتیں بخشیں۔ تمہیں ایک عظیم الشان ڈیوٹی سونپی تمہیں اپنا نائب

بنایا۔ اب میں اتنا قریب ہوں کہ تمہاری ہر حرکت دیکھ رہا ہوں نہیں بلکہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں جو خیالات موجزن ہیں ان سے بھی باخبر ہوں۔ اس دادو دہش اور اس امانت کا امین بنا دینے کے بعد اس کے متعلق باز پُرس بھی کروں گا۔ اس کا مواخذہ بھی ہو گا. اور مَیں ایسا علیم و خبیر ہوں کہ تمہاری کوئی حرکت اور کوئی ارادہ مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اور میرے یہاں نہ کوئی بہانہ چلے گا، نہ رشوت۔ میری اس نعمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے محبّت ہو اور میری اس قدرت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں میری ناراضگی کا خوف ہو مگر خوف کا جذبہ بعد میں پیدا ہُوا، محبّت کے جذبے کو اوّلیت حاصل ہے۔ اس لیے مجھے اپنا محبوب بناؤ اور خوش ہو جاؤ۔ کہ محبُوب تمہارے اتنا قریب ہے کہ اس سے زیادہ قرب کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اس مراقبے کا مقتضیٰ ہے اور اس مقتضیٰ پر سالک کی عملی زندگی استوار ہوتی ہے۔

قرب و بعد کا لفظ آتے ہی انسان کا ذہن فطرتاً مادی فاصلوں کے متعلق ہی سوچنے لگتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جو ذات ان حدود سے آزاد ہے اس کے لیے ان حدود کا تصوّر کیوں کیا جائے کسی مجرد حقیقت کے بیان کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دے سکتے۔ مگر شریعتِ اسلامیہ ہماری تفہیم کے لیے ایسا انداز بیان اختیار کرتی ہے۔ کہ حقیقت کی جھلک ہمارے ذہن کی گرفت میں آ سکے۔ مگر انسان پیکر تراشی شروع کر دیتا ہے۔

مادی کا قرب مادی سے یقیناً مکانی ہوتا ہے مگر مجرد کا قرب

مجرد سے یا مجرد کا مادی سے مکانی قرب نہیں ہوتا۔ مگر ان دونوں کا اثر پہلے قرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے مثلاً باپ اور بیٹا مکانی اعتبار سے ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دُور ہیں اور دو اجنبی ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہیں مگر باپ بیٹے میں اتنی دُوری کے باوجود جو قرب ہے وہ ان دو اجنبیوں کو حاصل نہیں قربِ مکانی کا رشتہ تو بڑا ہی کمزور قسم کا رشتہ ہے۔ اس لیے قرب کی ہر تعبیر کو زمان و مکان کی قیود میں محدود کر دینا بڑی کوتاہ نظری ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت شعار بندے کے اتنا قریب ہے کہ اس کی شاہ رگ بھی اتنی قریب نہیں۔ مگر یہ قرب وہی ہے جو مجرد کو مادی سے ہو سکتا ہے وہ نہیں جو مادی کو مادی سے ہوتا ہے۔

سالک جب اس راہ پر قدم بڑھاتا ہے تو یہ قرب دیدۂ باطن سے اسی طرح دیکھ لیتا ہے جیسا کہ کوئی دیدۂ ظاہر سے محسوسات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مراقبات ثلاثہ ختم ہوئے۔ یہ مراقبات راسخ ہو جائیں تو سالک کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان مستحکم ہو جاتا ہے۔ توکل علی اللہ کا وصف پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے اصولِ تجویز کے تحت زندگی بسر کرنے کی پریشانیوں سے نجات ملتی ہے۔ اور اصولِ تفویض کی پُربہار فضاؤں میں رہ کر پُرسکون زندگی بسر کرنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ کسی فیصلے کے خلاف لب کشائی تو کجا دل میں شکایت کا تصور بھی نہیں آتا۔

اس کی معیت کا احساس ایک طرف باطل کے مقابلے میں جری بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف بے راہروی کے سامنے ایسی رکاوٹ کا کام دیتا ہے کہ اس سمت قدم اٹھنے ہی نہیں پاتے اور محبوب کے قرب کا احساس محبت کے جذبے کو ابھارتا ہے اور سالک اس راہ پر گامزن ہے جس کی نشاندہی ان الفاظ سے کی گئی کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (۲: ۱۶۵)

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا حبك وحب من يحبك

مجلسِ ذکر

(۷)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مراقبات ثلثہ کے بعد دوائر محبت آتے ہیں۔ دائرہ کا لفظ سُنتے ہی ذہن مرکز کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ مرکز ہی سے دائرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ دائرہ کا محیط خواہ کتنا طویل ہو لا محالہ مرکز کے گرد ہی گھومنا پڑتا ہے۔ گویا مرکز اور دائرہ لازم و ملزوم ہیں۔

دائرہ محبت اوّل میں وظیفہ ہے۔

یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔ (۵:۵۴)

اس وظیفہ کے الفاظ کی ترتیب میں ایک نکتہ ہے، ایک طرف سے ابتدا ہو رہی ہے۔ دوسری طرف سے ردِّعمل۔ یعنی ابتدا ہی نہ ہو تو ردِّعمل کیونکر ہو۔ اس وظیفہ کا عمل ایک مثال سے سمجھئے۔ اس نقشے پر غور کیجئے۔

یُحِبُّھُمْ کا فاعل مرکز ہے۔ مرکز سے محبت کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ اور دائرے میں پھیل کر محیط کی طرف جا رہی ہیں۔ دائرہ میں محیط تک مخلوق ہے جہاں سے یحبونہٗ کا ردِّ عمل ہوتا ہے خالق سے مخلوق کی طرف تو بلا امتیاز محبت کی روشنی پھیلتی ہے۔ مخلوق میں کوئی باغی ہو یا اطاعت شعار چھوٹا ہو یا بڑا۔ مرد ہو خواہ عورت گورا ہو یا کالا
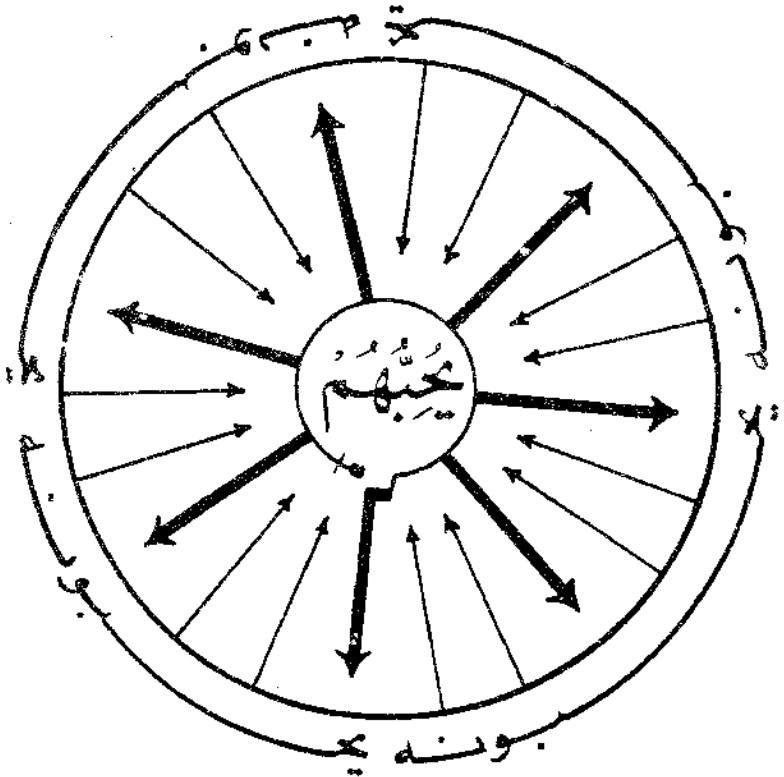
خالق کی محبت کا اثر ہر ایک پر پہنچتا ہے۔ پوچھو گے وہ کیسے خالق نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہاری پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں تمہاری محبت رکھ دی ورنہ ایک انسان کے بچے کو پالنا محبت کے جذبے کے بغیر ممکن

ہی نہیں پھر تمہاری زندگی کی ضروریات کائنات میں پھیلا دیں پھر اس کائنات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی صلاحیت تمہارے اندر پیدا کی یہ اعضا دیئے جن سے تم کار زارِ حیات میں اسلحہ کا کام لیتے ہو۔ سوچو کیا یہ محبّت کے کرشمے نہیں کیا انعامات و احسانات کی اس بارش میں کبھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کھیت میں برسے اور کہاں سے بے برسے گزر جائے۔ کُھلی آنکھوں سے کوئی دیکھے تو کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یحبھم کا عمل بلا امتیاز ہوتا ہے۔ مگر اس بارش کی قسم کا ایک اور ابرِ بہاری بھی ہے اور وہ ہے ہدایت کی بارش اور وہ تو اس محبت کی واضح دلیل ہے وہ ابرِ بہاری ہر کھیتی پر برستا ہے مگر ہر طرف اس کا استقبال یکساں نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس بدلی کی پہلی چمک دیکھ کر ہی اپنے برتن اُلٹے کر دیتے ہیں کہ بدلی برسے تو ایک قطرہ بھی ہمارے برتن میں نہ آنے پائے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ بدلی اٹھی اور برتن لے کر کھلے میدان میں آ گئے اور جب بدلی برسی تو لپک کے اس کا ہر قطرہ سمیٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف سے یحبھم کا ردِ عمل و یحبونہ کی صورت میں ہونے لگا۔ بلکہ ہم ضمیر کا اصل مرجع ہی یہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طرف سے ردِ عمل یحبونہ کی صورت میں ہونے لگا۔

یحبھم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء اِدھر سے ہوتی ہے یعنی وہ بلاتے ہیں تو کوئی آتا ہے وہ بلائیں نہیں تو آئے کون۔ وہ پٹ کھولتے ہیں تو داخلہ ملتا ہے وہ دروازہ ہی بند کر دیں تو کوئی داخل ہی کیسے ہو۔ وہ جذب کریں تو کوئی کھچا چلا آئے۔ اِدھر سے کشش نہ ہو تو ادھر سے حرکت کیسے ہو مگر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی بھاگتا ہے اور اس پر کمندیں ڈالی جاتی ہیں اور کوئی پاس رہ کر بھی محروم رہتا ہے۔ عمرؓ کو بُت خانہ سے کھینچ کر قدموں میں

لا بسایا اور عبد اللہ بن ابی مسجد نبویؐ میں رہ کر محروم رہا۔ مگر یہ کلیہ نہیں بلکہ اصول یہ ہے کہ اُدھر سے بلاوا تو آتا ہے مگر اُدھر بڑھنے کے لیے اِدھر سے ارادہ بھی تو پیدا ہو۔ اور قدم تو حرکت میں آئیں۔

یعنی یحبونہ کا ردِعمل اس طبقے کی طرف سے ہوتا ہے جو ہدایت کی بارش کا ہر قطرہ سمیٹنے کے لیے اپنے قلب کی طرف کا رُخ سیدھا کرکے عرصۂ حیات میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عمل ہوتا کیونکر ہے۔ دیکھو ایک چراغ روشن کرو اس کے گرد کچھ فاصلے پر آئینے رکھو دیکھو روشنی کی کرنیں چراغ سے نکلتی ہیں آئینہ پر عکس پڑتا ہے یعنی کرنیں آئینہ میں منعکس ہو کر لوٹتی ہیں گویا عمل انعکاس شروع ہے۔ لو اب ان آئینوں کو ہٹا کر میلے کچیلے شیشے کے ٹکڑے یہاں رکھو دیکھو چراغ سے کرنیں تو اسی طرح پھوٹ رہی ہیں مگر ان میلے ٹکڑوں کا یہ حال ہے کہ نہ شعاعوں کو جذب کرتے ہیں نہ عملِ انعکاس ہوتا ہے یہ کیوں؟ اس لیے کہ گو وہ شیشے کے ٹکڑے ہیں اگر صاف ہوتے تو کم از کم ان سے روشنی کی کرنیں پار تو ہو جاتیں مگر یہ اس قدر میلے ہیں کہ یہ عمل بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر مجلّی ہوتے تو یہ کرنیں منعکس ہو کر ماحول کو اور زیادہ روشن کر دیتیں۔

بس اِسی مثال سے سمجھو کہ سالک نے اب تک آئینہ قلب کے تجلیہ میں کوشش صرف کی اپنے قلب کو اس قابل بنا لیا کہ اب اس میں محبت کی کرنیں پڑیں تو عمل انعکاس شروع ہو جائے اور محبت کی کرنیں سیدھی مرکز کی طرف دوڑنے لگیں ہاں یہ خوب سمجھ لو کہ محبت کی کرنیں جب منعکس ہوتی ہیں تو ان کا عمل دو طرح کا ہوتا ہے۔ اصل میں تو لوٹ کر مرکز کی

طرف جاتی ہیں۔ مگر دورانِ سفر ماحول کو بھی منور کرتی چلی جاتی ہیں، ان کا زاویہ انعکاس زاویہ وقوع سے اُلٹے رُخ نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ مرکز گریز ہوتی ہیں سالک نے آئینۂ قلب کو پہلے صیقل کر رکھا ہے جانتے ہو کس تدبیر سے ہاں تدبیر وہی ہے جو اس عظیم صیقل گر نے بتائی جس نے کروڑوں دلوں کو خود صیقل کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ

لکل شیئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللّٰہ

ہر چیز کے صیقل کرنے کی تدبیر مختلف ہوتی ہے مگر ہوتی ضرور ہے اور دلوں کا صیقل اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے تو سالک نے جب اپنے دل کو صیقل کر لیا تو اب اس کے قلب سے یحبھم کے جواب میں ایک گونج اٹھتی ہے ویحبونہ۔ تو معلوم ہُوا کہ یحبھم کے جواب میں ویحبونہ کی آواز اس وقت اٹھتی ہے۔ جب آئینہ قلب کو صیقل کیا جا چکا ہو۔

پھر دیکھو مقناطیس کا ایک بہت بڑا ٹکڑا رکھ کے اس کے قریب لوہے کا ایک ایسا ٹکڑا رکھو جس پر زنگ کی تہیں جم چکی ہوں دیکھو کیا مقناطیس کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے؟ ہرگز نہیں اب ذرا اسے ہٹا کر ایک صاف ستھرے فولاد کے ٹکڑے کو دیکھو یا اسی ٹکڑے پر ریتی یا ریگمال سے رگڑائی کر کے اس کا زنگ دُور کرو۔ جب بالکل صاف ہو جائے تو اُسے مقناطیس کے قریب رکھو دیکھو کھچا چلا آ رہا ہے کیوں؟ اس لیے کہ گو ٹکڑا وہی ہے مگر زنگ دُور ہو چکا اس لیے جذب و انجذاب کا عمل شروع ہو گیا۔

یہی حالت انسانی قلب کی ہے انسان جب اپنے خالق سے بغاوت کر بیٹھتا ہے تو اس کے قلب پر زنگ جم جاتا ہے اس کی خبر خود خالق

لے دی کہ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ (۸۳: ۱۴)
یعنی ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے قلوب پر زنگ کی تہیں جم گئیں جب ذکرِ الٰہی کی کثرت سے اور اس ریتی سے دل کو رگڑا جاتا ہے۔ تو زنگ دُور ہو گیا اب وہ دل اس قابل ہو گیا۔ کہ جب یحبہم کی مقناطیس اسے کشش کرے گی تو یحبونہ کہتا ہُوا اس کی طرف دوڑنا شروع کر دے گا۔
فلسفہ اجتماع والوں نے تعلق کے درجے متعین کئے ہیں جو کوئی ان کی ایجاد نہیں بلکہ مسلسل مشاہدات کا حاصل ہے۔ تعلق کے مدارج کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ میلان، رجحان، شوق یا دلچسپی، محبت، عشق اور جنون یعنی تعلقات کے سلسلے میں دو قسم کے تجربے ہوتے ہیں۔ تعلقات کا بڑھنا یا گھٹنا اور ان دونوں کی وجوہات ہوتی ہیں۔ اسی طرح سالک کو ابتداء میں بندے اور رب کے درمیان تعلقات کا احساس پیدا ہوتا ہے پھر اس کے اندر تعلق قائم کرنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے یعنی میلان ہے پھر اس کے اندر آگے بڑھنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہ رجحان ہے پھر اس تعلق کے قائم کرنے کی تدبیروں اور اس کے متعلق باتیں کرنے اور سُننے کا شوق پیدا ہوتا ہے پھر یہ شوق لے کشاں کشاں بحرِ محبت میں شادی کے لیے لا کھڑا کرتا ہے۔ زبانِ وحی میں یہی درجہ مطلوب ہے۔ عشق اور جنون کا لفظ قرآن کریم میں غالباً کہیں نہیں آیا۔ ہاں حدیث نبویؐ میں یہ آیا ہے کہ

اکثروا ذکر اللہ حتی یقولوا مجنون

مگر اس اسلوب میں بھی عجیب نکتہ ہے کہ

حتی تکونوا مجنون نہیں فرمایا کہ یہاں تک کہ تم دیوانے ہو جاؤ بلکہ فرمایا کہ حتی یقولوا مجنون کہ کہنے والے تمہیں دیوانہ کہنے لگیں معلوم ہوتا ہے

کہ انسان نے ہمیشہ محبت کو جنون ہی کہا ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر کسی اور فرزانگی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرصورت سالک نے اپنے لطائف منور کئے۔ مراقباتِ ثلاثہ کئے یعنی میلان، رجحان اور دلچسپی کے مراحل سے گزرا اور چونکہ آگے بڑھ رہا ہے اس لیے لازماً محبت کی منزل آنی چاہیئے۔ مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے محبت کے دائرے میں داخل ہوا ہی لیے اس مقام پر سالک کو دائرۂ محبت میں لا کر محبت کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔

سلیقۂ محبت میں پہلی بات یہ سکھائی جاتی ہے کہ محبوب کے انتخاب میں احتیاط اور عقلمندی سے کام لو، تم جسے محبوب بنا لو گے کیا ضرور ہے کہ وہ بھی تم سے محبت کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مخلوق میں تم جسے بھی محبوب بناؤ گے وہ فانی ہوگا۔ فانی کی محبت کی کیا خوشی، پھر جسے تم محبوب بناؤ گے وہ خود کسی نہ کسی پہلو سے محتاج ہوگا۔ تو کسی مطلب پرست کو محبوب بنانے میں کون سی دانشمندی ہے اس لیے تم محبوب بناؤ تو اسے جو خود تم سے محبت کرتا ہے جو باقی ہے فانی نہیں۔ جو بے نیاز ہے محتاج نہیں اس کی کوئی غرض تم سے وابستہ نہیں اس لیے اوّل قدم پر یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ یحبھم وہ ایسا محبوب ہے کہ پہلے وہ تم سے محبت کرتا ہے۔

دوسرا سلیقہ یہ سکھایا جا رہا ہے۔ کہ جب وہ محتاج بھی نہیں فانی بھی نہیں اور محبت میں پہل کرتا ہے۔ تو شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے۔ وفاداری کا مطالبہ یہ ہے نیاز مندی کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم اسی سے محبت کرو۔ لہٰذا کہلایا جاتا ہے۔ ویحبونہٗ۔ ایسے محبوب کے ساتھ محبت کے جواب میں محبت نہ کرنا بے دانشی بھی کم نصیبی بھی ہے۔ بے وفائی بھی ہے اور اس میں ہلاکت بھی ہے۔

تیسرا سلیقہ یہ سکھایا کہ پلٹ کر ذرا دائرۂ محبت کو دیکھو محبوب کی طرف سے جب یحبھم کا عمل شروع ہُوا تو چاہنے والے ایک تو محبوب سے دُور تھے۔ دوسرا ایک دوسرے سے بھی دُور تھے۔ جُوں جُوں مرکز کی طرف بڑھنے لگے وہ نہ صرف محبوب کے قریب ہونے لگے بلکہ ایک دوسرے کے قریب بھی آنے لگے۔ گویا محبُوب کی محبت میں ترقی کے ساتھ ساتھ مخلوق کا باہمی قرُب بھی بڑھنے لگا۔ معلوم ہُوا کہ حقیقی محبت جہاں ہو گی وہاں صرف قربِ محبُوب ہی حاصل نہ ہو گا۔ بلکہ اس محبت کی خاصیت یہ ہے کہ چاہنے والوں میں بھی باہمی قرب بڑھنے لگتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو یا یہ محبت کچّی ہے یا سرے سے محبّت ہی نہیں بوالہوسی ہے۔ کیونکہ حقیقی محبت رقابت کے جذبات پیدا ہی نہیں ہونے دیتی۔

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد
بطوفِ شمع ای پروانہ با پروانہ می سازد

اس دائرہ کی تربیت کے دوران سالک کے لطیفۂ نفس کے سامنے ایک نورانی دائرہ محسوس ہوتا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ خواہش کرنا نفس کی خاصیّت ہے۔ ہر خواہش محبُوب اور مرغوب تو ہوتی ہے مگر خواہش کا کوئی خاص امتیازی مرکز بن جائے تو انسانی کوشش اسی کے گرد گھومتی ہے۔ اس سبق میں سالک کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ نفس کو اپنی خاصیت سے محروم نہیں کر سکتے۔ مگر اتنا کرو کہ اس کی خواہش کا مرکز "فانی" سے بدل کر "باقی" بن جائے۔ جب مرکز بنے گا تو محبت لازماً پیدا ہو گی اور "باقی" سے محبت پیدا ہو جانا ہی مقصُود اصلی ہے۔

اس مراقبے کا مقتضیٰ کیا ہے؟ یہی کہ محبت اپنا اثر دکھائے۔ محبت کی

خاصیت یہ ہے کہ محبت کرنے والا محبوب کے تابع ہو جائے۔ اور اس کا مشاہدہ تو فانی کی محبت میں بھی ہوتا ہے ہر شخص کی بات ٹالی جا سکتی ہے۔ مگر محبوب کی بات کسی صورت میں بھی ٹھکرائی نہیں جا سکتی اور محبوب کو خوش کرنے کے لیے انسان جان، مال، عزت و آبرو ہر چیز کی قربانی دے سکتا ہے۔ اور دیتا رہتا ہے اس لیے اب سالک کی عملی زندگی پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بات صرف اپنے رب کی اپنے محبوب کی مانتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کی بات کی پروا نہیں کرتا۔ مگر یہ ماننا ضابطے کی کارروائی نہیں ہوتی بلکہ بات مانتا ہے اور محبت کے جذبے کے ساتھ تعمیل کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی علامت محبت کا معیار یہی بتایا۔ ارشاد ہے۔

مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ۔

یعنی جسے میرے طریقے پہ چلنا پسند۔ جو میری بات دل سے مانتا ہے۔ اسے واقعی میرے ساتھ محبت ہے بات ماننے نہیں۔ سنت کی پیروی کا جذبہ نہ ہو اور دعویٰ محبت کا کرے تو وہ جھوٹا ہے۔ یہ محبت نہیں محبت کا بہروپ ہے۔ محبت کی ایکٹنگ ہے خود فریبی ہے۔

محبت اور اتباع یا اطاعت کا تعلق یوں سمجھئے کہ محبت سٹیم ہے اور یہ جسم انجن ہے اور اعضاء جسمانی اس انجن کے کل پرزے ہیں۔ اس انجن کے چلنے کی تین صورتیں ہیں۔

اوّل سٹیم نہیں مگر انجن صحیح سالم ہے۔ کل پرزے پہیے درست ہیں مگر چلے گا کیسے۔ ایک ہی طریقہ ہے کہ ٹھیلے کی طرح اسے دھکیلتے چلو دھیرے دھیرے چلتا رہے گا۔ جب دھکیلنے سے تھک گئے انجن رک گیا۔ محبت کے بغیر اعمال کی یہی صورت ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سٹیم بھی ہے اور انجن کے کل پُرزے بھی درست ہیں اب تو یہ انجن اڑا چلا جائے گا۔ یہ محبت کی سٹیم لے رکنے نہ دے گی۔

ان دونوں صورتوں میں اس امر کی ضرورت ہے کہ انجن پٹڑی پر چلے۔ اگر پٹڑی سے اُتر گیا تو دھکیلے سے چلے گا نہ سٹیم سے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سٹیم ہوئی تو کھڑا کھڑا سیٹیاں بجاتا رہے گا۔ شوں شوں کرتا رہے گا۔ جسے منزل پر پہنچنا ہو وہ بھلا ان سیٹیوں سے اور شوں شوں سے کب مطمئن ہو سکتا ہے تو اس راہ میں محبت سٹیم ہے اور پٹڑی اتباعِ سُنّت کی صراطِ مستقیم ہے اگر سُنّت پیشِ نظر نہیں تو بس سیٹیوں اور شوں شوں سے دل بہلاتے رہو۔ منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ انجن صحیح سالم ہے مگر نہ پٹڑی ہے نہ سٹیم تو ظاہر ہے کہ اس کی حیثیت بس درشنی انجن کی ہے یہ میوزیم میں تو رکھا جا سکتا ہے مگر کسی کام نہیں آ سکتا۔

سٹیم کے ہونے اور نہ ہونے میں ایک فرق ضرور ہے کہ اگر سٹیم نہیں تو دھکیلا جا رہا ہے اور پٹڑی سے اُتر گیا ہے تو معمولی نقصان ہو گا اور اگر سٹیم سے اڑا جا رہا ہے اور پٹڑی سے اُتر گیا ہے تو اس کے پُرزے ڈھونڈے نہیں ملیں گے۔

سالک کو اس خطرے سے آگاہ رہنا چاہیئے۔ کوشش یہ ہو کہ اتباعِ سُنّت سے انحراف نہ ہو۔

دائرہ محبت اوّل کے بعد دائرۂ محبّت دوم ہے یہ پہلے دائرے سے بڑا ہے اس کا وظیفہ بھی یہی ہے۔ یحبھم و یحبونہ یعنی محبّتِ الٰہی میں

ترقی ہو رہی ہے اس کی وسعت بڑھ رہی ہے قربِ الٰہی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

پھر دائرہ محبت سوم ہے یہ دائرہ پہلے دونوں دائروں سے بڑا ہے گویا محبت کی وسعت لامحدود ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا وظیفہ بھی یہی ہے۔ یحبھم و یحبونہٗ۔ یعنی بات حُبّ سے اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔

کام کرنے اور محبت سے کام کرنے میں فرق ہے کام خواہ کیسا ہو محنت چاہتا ہے۔ مجاہدہ کا مطالبہ کرتا ہے اور مجاہدہ نفس کو شاق گزرتا ہے۔ نفس تو لذت اور سہل انگاری کا رسیا ہے۔ وہ محنت سے بھاگتا ہے۔ مجاہدہ کا نام نہیں لیتا اسے شرابِ محبت پلاؤ۔ اِسے محبت کا انجکشن دو۔ جب محبت کا نشہ اس پر سوار ہو جائے گا۔ تو اسے مجاہدہ شاق نہیں گزرے گا۔ اس کے لیے محبوب کی بات ماننا آسان ہو جائے گا۔ محبت ایک ایسی طاقت ہے کہ اس کے سامنے پہاڑ بھی مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتے ہیں۔ میدانوں کی وسعتیں سمٹ جاتی ہیں۔ طوفانوں کے رُخ مُڑ جاتے ہیں۔ اس لیے سالک کو محبتِ الٰہی کے نشے سے سرشار کیا جاتا ہے تاکہ اس کا نفس اپنے محبوب کی بات سننے اور ماننے کے لیے بے تاب ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا تعلق اپنے بندے سے ضابطے کا نہیں بلکہ محبت کا ہے۔ قرآنِ حکیم کا مُطالعہ کرو تمہیں محسوس ہو گا۔ کہ ایک حکم ہے ایک بات ہے مگر بار بار نئے اسلوب، نئے طرزِ ادا اور نئے انداز سے کہی گئی ہے ایک بات بار بار سمجھانا اور اس کو سمجھانا جس کے فائدے کی ہے اور اس کا سمجھانا جس کا کچھ سنورتا بگڑتا نہیں محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ تعلق ضابطے کا ہوتا تو

ایک بار حکم دے دینا کافی تھا۔ پھر بندہ بات نہ مانے تو مہلت بے موقع دیا جاتا ہے قانون امہال کا اطلاق ہونے لگتا ہے اگر تعلق ضابطے کا ہوتا تو ہوتا یوں کہ اِدھر نافرمانی ہوئی اُدھر دھر لیے گئے۔ جب اُدھر سے یہ سلوک ہے تو اِدھر سے بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ بندے کا تعلق اللہ سے محبت کا ہو ضابطے کا نہ ہو۔

اللہ سے محبت پیدا ہونے کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق سے خیرخواہی کا جذبہ اُبھرنے لگتا ہے اور یہی جذبہ کمال دین ہے بلکہ اصل دین ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ الدین النصیحۃ دین نام ہی مخلوق کی خیرخواہی کا ہے۔ جب اللہ سے معاملہ کھرا ہو گا۔ اللہ کے رسولؐ سے معاملہ یقیناً کھرا ہو گا اور اس کھرے پن سے اللہ کے بندوں کی سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ انہیں دعوتِ الی اللہ دی جائے۔ انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے کی فکر کی جائے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ اللہ کی محبت جب دل میں گھر کر جاتی ہے تو محبوب کی مخالفت کی بات سُننا۔ ایسا منظر دیکھنا گوارا نہیں ہوتا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ (۴: ۱۴۰)

یعنی جب تمہیں ایسے لوگوں سے پالا پڑے۔ جو احکام الٰہی کا انکار کر رہے ہیں ان کا مذاق اُڑا رہے ہیں تو ایسی مجلس میں مت بیٹھو۔ اور اگر اس کے باوجود بھی تم وہاں بیٹھ گئے۔ خواہ تم

خاموش تماشائی ہی بنے رہے تمہارا شمار انہی میں سے ہو گا۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رویے میں تدریج کی صورت فرما دی۔
من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ
وان لم یستطع فبقلبہ فذالك اضعف الایمان اوکما قال
یعنی جب تم اپنے محبوب۔ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی مخالفت کا منظر
دیکھو تو تمہارا فرض ہے کہ قوت سے اُسے روکو اگر ایسا کرنا تمہاری بساط
سے باہر ہے تو کم از کم اس کی رکاوٹ کے لیے زبان کو تو حرکت دو
اگر تم ایسے گئے گزرے ہو کہ اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم اس حرکت
کو دل سے تو بُرا سمجھو۔ اور یہ رویہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے۔
تم دیکھتے نہیں کہ اسمبلیوں میں بل پیش ہوتے ہیں، پاس ہوتے ہیں۔ مگر
کچھ لوگ واک آؤٹ کر جاتے ہیں یہ واک آؤٹ کیا ہے یہی تو اُن کی
ناپسندیدگی اور بے بسی کا اظہار ہے۔
اب ان تین دائروں کی کچھ تفصیل بھی سُن لو۔ معاملہ ہے بندے اور رب
کا۔ یہ مخلوق ہے وہ خالق۔ یہ گوشت پوست کی ایک مخصوص اور محسوس صورت
اور وُہ ایسا کہ جسم اور مکان و زمان کی قید سے پاک یہ ایسا کہ کہتا ہے سے

یہ بجا کہ خلوت دل میں تو ہے ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر آ کے سامنے بیٹھ جا کہ نظر کو خوئے مجاز ہے

وہ ایسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ
کہ نظر کو اسے دیکھنے کی قوت کہاں حاصل ہے۔
یہ کہتا ہے کوئی خیال تصویر تو سامنے رکھ لوں وہ فرماتا ہے۔

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ

اس کی مثل جو کوئی نہیں تم کس نمونے کو پیشِ نظر رکھ کر خیال سے پیکر تراشی کرو گے۔ اس لیے تم یہی کہو۔ ؎

اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان من است

تم سے پہلے اس راہ کے مسافر ایسا ہی کہہ گئے ہیں کہ

لَوۡ كُشِفَ الۡغِطَاءُ مَا ازۡدَدۡتُ يَقِيۡنًا

یعنی اگر درمیانی حجابات اُٹھ بھی جائیں تو میرے یقین میں کچھ اضافہ نہیں ہو گا۔ مگر با ایں ہمہ راہرو کے لیے کچھ سہولتیں ہیں کچھ تدابیر۔ اور یہ دوائر محبت انہی تدابیر کے مظاہر ہیں۔

پہلا دائرہ۔ اسماء کا ہے ارشاد ہے۔

وَ لِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى

اللہ کے بہت سے پیارے پیارے نام ہیں، اسم اور مسمی میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسم سے مسمی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ مسمی کی محبت کا اولین تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اسم سے محبت ہوتی ہے کہتے ہیں قیس عامری کو کسی نے دیکھا کہ اپنی انگلی سے زمین پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

کہنے لگا لیلیٰ کا نام لکھ رہا ہوں۔ مسمی تک پہنچ نہیں سکتا۔ اسم سے ہی اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام بیشمار ہیں۔ ۹۹ نام تو مشہور ہیں ہر نام اس کی ایک

خاص صفت کا مظہر ہے اور اہلِ طریق کہتے ہیں کہ ہر شخص کے لیے ایک خاص صفاتی نام مربّی ہوتا ہے۔ جس سے ان کو طبعی مناسبت ہوتی ہے مگر اسم اللہ اس کا ذاتی نام ہے اور ذات میں تمام صفات موجود ہوتی ہیں اور ذاتی نام تمام صفاتی ناموں کا مجموعی مظہر ہوتا ہے اس لیے اس دائرے میں سالک کو اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں غور و فکر کرنا ہوتا ہے یعنی اس دائرے میں سالک کو معرفتِ ذات بواسطۂ اسمار کی مشق کرائی جاتی ہے۔

دوسرا دائرہ صفات کا ہے۔ صفات کا دائرہ بہت وسیع ہے اللہ کی قدرت دیکھو اس کی صنعت کے نمونے دیکھو کیا اس کی صفات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دائرہ میں اللہ کی محبت اس کی صفات کے واسطے سے سالک اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جمادات کو دیکھو ریت کے ایک ذرّے سے لے کر فلک بوس پہاڑ تک ہر طرف اس کی صفات کے مظہر نظر آئیں گے۔ ننھے مُنّے پودے کے ایک پتّے سے لے کر اُونچے اُونچے تناور درختوں تک ہر جگہ اس کی صنعت کے نمونے دیکھو گے۔ ایک بے مایہ چیونٹی سے لے کر جنگل کے گرانڈیل ہاتھی تک کی زندگی پر غور کرو ہر مقام پر اللہ کی صفات کا اظہار ہو رہا ہے۔ انسانی زندگی پر نگاہ کرے یہ بوقلمونی یہ رنگا رنگی مزاج، عادات۔ اقوال افعال میں یہ گوناں گونی اس کی صنعت کے بے شمار مظہر ہیں، غرض اس کی کائنات میں اس کی صنعت پر جس قدر تدبّر و تفکّر کرو گے اس سے محبت بڑھتی ہی جائے گی۔ تو اس دائرے میں معرفت ذات بواسطۂ صفات کی تربیت کی جاتی ہے۔

تیسرا دائرہ ذات کا ہے۔ یہ بس نام کا دائرہ ہے ورنہ اس کی وسعت کی کوئی حد نہیں کسی جگہ یہ ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں نہ اسمار پیشِ نظر ہوتے

ہیں نہ صفات۔ گویا اس دائرہ میں معرفت ذات بلا واسطہ اسماء و ذات کی تربیت ہوتی ہے۔

کہتے ہیں محبت کی بُنیاد تین چیزوں پر ہے۔

جمال۔ کمال۔ نوال۔ یہ تینوں وصف ہیں۔ صفات ہیں۔

یعنی کسی سے محبت جو ہوتی ہے تو کبھی اس کے جمال کی وجہ سے کبھی اس کی داد و دہش جُود و سخا کی وجہ سے کبھی اس میں کسی کمال کی وجہ سے مگر اس محبّت کے ساتھ یہ لازم آتا ہے۔ کہ اس محبوب کے بغیر یہ صفات کسی اور میں پائی جائیں۔ تو محبّت کا رُخ بدل جائے گا۔ محبّت کا مرکز تبدیل ہو جائے گا یا اگر یہ صفات نہ پائی جائیں تو سرے سے محبّت ہی نہ ہوتی۔ مگر محبّت کی ایک قسم ہے ذات کے ساتھ۔ نہ یہ ذات تغیّر پذیر ہے نہ محبّت کا قبلہ بدل سکتا ہے۔ اس سے محبّت ہے۔ اس لیے کہ وہ وہ ہے اس لیے کہ وہ محبوب ہے اس لیے کہ وہی محبّت کا اہل ہے۔

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گلہ
ان سے بھی تو پُوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

کسی حَسین کا پیارا ہونا ضروری نہیں کسی جواد اور پیکر جود و سخا کا پیارا ہونا ضروری نہیں کسی صاحبِ کمال کا پیارا ہونا ضروری نہیں مگر کسی پیارے کا پیارا ہونا ضروری ہے۔

گو اس ذات میں سب صفات ہیں۔ جمال میں لاثانی۔ نوال میں بے نظیر۔ کمال میں بے مثل۔ مگر محبّت اس لیے کہ وہ ذات محبوب ہے۔

سوال یہ ہے کہ ذات کا تصوّر کیسے ہو، جب نظر اسے دیکھ نہیں سکتی۔ ذہن اسے سوچ نہیں سکتا۔ خیال اس کی کوئی صُورت نہیں پیش کر سکتا۔ تو اس کا

تصور کیسے ہو؟ بات واقعی پیچیدہ ہے۔ مگر فرض کیجئے آپ ایک ایسے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ جن کے درمیان ایک ایسا پردہ لٹک رہا ہے جس کے آرپار نظر نہیں جا سکتی۔ آپ کو یقین ہے کہ پردہ کے پیچھے ایک ایسی ہستی بیٹھی ہے۔ جو ہمہ مقتدر مگر بڑی محبوب آپ نے دیکھا نہیں مگر اس کی موجودگی کا یقین ہے ور یہ بھی یقین ہے کہ گو مجھے وہ نظر نہیں آتا۔ لیکن اس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے۔ کہ میری حرکت اسے نظر آتی ہے میری ہر آواز وہ سُنتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے دیواروں میں کوئی منعکس آئینے لگا رکھے ہوں۔ ممکن ہے مکان کی دیواروں میں کوئی خفیہ سیٹ رکھے ہوں۔ جن کا ریسیونگ اور ٹرانسمٹنگ سسٹم آٹومیٹک ہو اس حالت میں سوچئے آپ کی کیفیت کیا ہو گی۔ آپ کا رویہ کیسا ہوگا۔ آپ کی سوچ کا انداز کیا ہو گا۔ اس سائنسی دور میں یہ بات کوئی غیر ممکن نہیں بلکہ اس کی مثالیں عام ملتی ہیں۔ اسی مثال کو ذرا پھیلا کر دیکھئے وہ ہمہ مقتدر بلکہ قادرِ مطلق اور محبوب ہستی ہر جگہ موجود ہے اس کی موجودگی پر آپ کو یقین ہے اس کے علیم و خبیر ہونے پر آپ ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے سمیع و بصیر ہونے میں آپ کو شک نہیں پھر سوچئے آپ کا رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ یہی کہ تم نہیں دیکھ رہے مگر رویہ وہ اختیار کرو۔

کانك تراہ جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ وہ موجود بھی ہے اور مجھے دیکھ بھی رہا ہے۔

در حضور دوست ہر جانب نظر کردن خطا است
یک زمان حاضر نشیں اے دل کہ جانان ناظر است

مجلسِ ذِکر (۸)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دائرہ محبت کے بعد مراقبہ اسم الظاہر والباطن کرایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ چار اسماء یا چار صفات علم و معرفت کے ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

الاوّل والاخر والظاہر والباطن

اس مراقبہ کا وظیفہ یہی ہے۔

ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِن

آپ اپنے متعلق سوچیں آپ کی ایک ابتدا ہے ایک انتہا ہے ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے۔ آپ پر ہی کیا موقوف ہے کائنات کی ہر چیز کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہے ایک ظاہر اور ایک باطن ہے مگر اللہ تعالیٰ کی صفت جو اوّل ہے تو اس سے مراد یہ ہے ہر ماسوٰی سے اوّل ہے اور صفت الآخر سے مراد یہ ہے کہ ہر ماسوٰی سے آخر ہے نہ اس کی اوّلیت کی کوئی حد ہے۔ نہ اس کے الاخر ہونے

کی کوئی حد ہے اس کی ذات ہر ماسویٰ سے پہلے ہے اور ہر ماسویٰ کے بعد وہ باقی رہے گا اور صفت الظاہر یہ ہے کہ ہر شے پر غالب ہے اس سے اس کا غلبہ اور اس کی عظمت مُراد ہے۔ اور ظاہر وہ ہوتا ہے جس نے باطن کا احاطہ کر رکھا ہوتا ہے تو الظاہر سے مُراد یہ ہوئی کہ وہ ہر شے کو محیط ہے۔ الباطن سے مُراد قرب ہے کہ ہر شے کی ذات سے بھی وہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ پس الاوّل سے اس کے قِدم کا اظہار ہے اور الآخر سے اس کے دوام اور بقا کا اظہار ہے الظاہر سے اس کے علوشان اور عظمت مُراد ہے اور الباطن سے اس کا قریب ہونا۔

الاوّل والآخر۔ دو صفات پر تدبّر کرنے سے سالک پر یہ کھلتا ہے کہ مخلوق پیدا ہونے میں اس کی محتاج ہے زندہ رہنے میں اس کی محتاج ہے۔ مخلوق کے لیے فنا ہے اس کا قیام عارضی ہے دل لگانے کی چیز نہیں الظاہر اور الباطن پر تفکر سے یہ کھلتا ہے کہ وہ اتنا ظاہر ہے کہ ہر چیز کا وجُود اس کی ذات پر دلالت کرتا ہے۔ ذرّے سے آفتاب تک ہر چیز کا وجود اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے بنانے والا۔ پیدا کرنے والا۔ اسے زندہ رکھنے والا۔ اسے فنا کرنے والا کوئی ضرور ہے ظاہر اتنا کہ ؎

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

الباطن ایسا کہ اس کی کنہہ اس کی حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا۔

علماء کے نزدیک یہ چار اسماء علم و معرفت کے ارکان ہیں اور اہلِ طریقت کے نزدیک اسم الظاہر والباطن سالک کے لیے دو بازو ہیں جن کی مدد سے سالک کی رُوح قربِ الٰہی کی طرف پرواز کے قابل ہوتی ہے۔

اس مراقبے کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سالک ماسویٰ سے فانی سے دل نہیں لگاتا۔ اور اس کی محبت بڑھنے لگتی ہے جو باقی رہنے والا ہے پھر سالک کے اندر اخلاص کا جذبہ ترقی کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے لیے ہر باطن بھی ظاہر ہے۔ ہر غیب میں شہود ہے ہر مخفی بھی نمایاں ہے اس لیے اس کے سامنے ظاہرداری نمائش، تصنع اور بناوٹ نہیں چل سکتی۔ اس کے ساتھ معاملہ کھرا رکھنا پڑے گا۔

پھر سالک کے اندر سے کبر اور خود بینی کا صفایا ہو جاتا ہے۔ اسے نہ اپنے علم پر ناز ہوتا ہے نہ اپنی معرفت پر غرہ۔ مستعار اور عارضی چیز پر بھلا کیونکر کوئی ناز کرے۔

پھر اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے اندر سنسر کا محکمہ قائم ہو گیا ہے۔ ایک CID موجود ہے جو نہایت قریب سے اعمال کی صورت اور ان کے محرکات، دل سے اُٹھنے والے خیالات اور ارادوں سے بھی واقف ہے۔ اس وجہ سے اس کی عملی زندگی کا سارا نظام اس انداز سے بدلتا ہے کہ اس کے عمل کا محرک محبتِ الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے اور اس کے ہر فعل کی صورت رضائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور سالک خود اپنی ذات کے لیے اور معاشرے کے لیے ایک رحمت ثابت ہونے لگتا ہے۔

وہ نورانی دائرے جو مراقبات و دائرِ محبت سے لطیفۂ نفس کے سامنے محسوس ہوتے تھے اس مراقبے میں سالک کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نور نے سالک کے ظاہر اور باطن کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سالک کو اپنے اندر اور باہر نور ہی نور محسوس ہوتا ہے۔

اسم الظاہر اور اسم الباطن کے متعلق حضرت مجدد سرہندیؒ لکھتے ہیں۔

"اسم باطن کی سیر کے متعلق کیا لکھا جائے اس سیر کا حال استتار اور تبطن کے مناسب ہے البتہ اس مقام سے صرف اس قدر بیان کیا جاتا ہے کہ اسم الظاہر کی سیر صفات میں ہے بغیر اس بات کے کہ اس کے ضمن میں ذات ملحوظ ہو اور اسم الباطن کی سیر بھی اگرچہ اسماء میں ہے لیکن اس کے ضمن میں ذات ملحوظ ہے اور یہ اسماء ڈھالوں کی طرح ہیں جو حضرتِ ذات کے حجابات ہیں۔

مثلاً صفت علم میں ذات ملحوظ نہیں ہے لیکن اس کے اسم علیم میں پردہ صفت کے پیچھے ذات ملحوظ ہے کیونکہ علیم ایک ذات ہے جس کی صفت علم ہے پس علم کی سیر اسم الظاہر کی سیر ہے اور علیم کی سیر اسم الباطن کی سیر ہے۔ باقی تمام اسماء و صفات کا حال اسی قیاس پر ہے۔"

مراقبۂ عبودیت

اس مراقبہ کا وظیفہ ہے۔

اَلنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ یَسۡجُدَان (۵۵:۶)

سالک اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک خاص مقررہ قانون تکوینی کے مطابق وجود میں آتی قائم رہتی اور غائب ہوتی ہے۔ جمادات کے لیے الگ قانون ہے۔ سورج مقررہ وقت پر مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ مقررہ وقت پر مغرب کی طرف جا کر نگاہوں سے اوجھل ہو

جاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ قانون تکوینی کی مخالفت کرکے اُلٹے رُخ چلنے لگے۔ چاند اپنے وقت پر ہلال دکھائی دیتا ہے اور مقررہ وقت پر بدر نظر آتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پہلی کو بدر دکھائی دے اور چودھویں کو ہلال نظر آئے۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ تمام اجرام فلکی مقررہ رُخ پر مقررہ رفتار سے مقررہ مدار پر سرگرم سفر ہیں ان کی مجال نہیں کہ اس سے سرمو انحراف کر سکیں اسی طرح تمام جمادات، اطاعت و فرمانبرداری کا حق ادا کر رہے ہیں اور اپنے خالق کے سامنے سراپا نیاز بنے ہوئے ہیں۔

نباتات پر غور کرو۔ آم کے درخت پر کبھی مالٹے کا پھل نہیں لگتا چیل اور دیودار کی جڑ سے آم اور انار کی شاخیں نہیں پھوٹتیں۔ انگور کی بیل پر کبھی آم کے پتے نہیں لگتے۔ نباتات کے لیے خالق نے جو احکام جاری کر دیئے ہیں۔ ان کی برابر تعمیل ہو رہی ہے کبھی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حیوانات کو دیکھو ان کے لیے اپنا اپنا قانون مقرر ہے شیر بھوکا مر جائے گا لیکن گھاس کھا کر گزارہ نہیں کرے گا اور بھیڑ بکری کبھی گوشت نہ کھائے گی۔ بھیڑ کے پیٹ سے بھیڑیا پیدا نہیں ہوتا اور بکری کے ہاں کبھی شیر کا بچہ پیدا نہیں ہوا۔ غرض ہر چیز کے لیے جو قانون تکوینی مقرر ہے، وہ اس کی پوری پوری پابند ہے یہی مراد ہے۔ اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ سے۔

پھر یہاں سالک کو یہ غور کرنا ہوتا ہے کہ انسان بھی کائنات کی پوری مشینری کا ایک پُرزہ ہے اور پُرزہ بھی بڑا اہم ہے کہ اسے اختیار دیا گیا چاہے اطاعت کرے چاہے بغاوت۔ مگر قانون تکوینی میں یہ بھی پوری طرح پابند ہے کبھی بغاوت نہیں کر سکتا۔ ہاں قانون تشریعی میں اسے اختیار دیا گیا ہے۔ یہی اختیار اس کے امتحان کا ذریعہ ہے اسی اختیار کی بدولت وہ

اشرف المخلوقات ہے جب اس کائنات کی مشینری کے باقی پُرزے یعنی جمادات نباتات، حیوانات، ایک ہی سمت میں یعنی اطاعت کے رُخ پر حرکت کر رہے ہیں۔ تو یہ پُرزہ جسے انسان کہتے ہیں اگر مقررہ سمت سے ہٹ کر اُلٹے رُخ یا غلط رُخ کی طرف حرکت کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ مشینری میں بگاڑ پیدا ہو گا۔ سکون اُٹھ جائے گا اور سارے بگاڑ کی ذمہ داری انسان پر ہوگی اس لیے سالک اس مقام پر پہنچ کر اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مشینری میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک ہی صُورت ہے کہ انسان بھی قانون کی پابندی، اطاعت اور بندگی کا شیوہ اختیار کرے۔ چنانچہ اس وقت سالک کی رُوح پکار اُٹھتی ہے۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی اور سر سجدے میں رکھ دیتا ہے۔

یہ الفاظ کیا ہے دو حقیقتوں کا اعتراف ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ ذات تمام نقائص اور ہر احتیاج سے پاک ہے جو اس ساری کائنات کا اور میرا رب ہے۔ مَیں اس کے علوشان اور عظمت کا اعتراف کرتا ہوں۔ دُوسرا یہ کہ جہاں تک اس ذات کے ساتھ میرا تعلق ہے مَیں سراپا احتیاج ہوں۔ عاجز ہوں لہٰذا بندگی ہی میرا منصب ہے اور مَیں اپنی عاجزی اور اس کی عظمت دونوں کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سامنے سربسجود ہوتا ہوں۔ اور سالک یہ حقیقت پا لیتا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔

اس مراقبے کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سالک جب اپنے مقام یعنی عبودیت سے آشنا ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی اور زندگی کا ہر پہلو اس امر کی شہادت دیتا ہے۔ کہ مَیں اِسی کا بندہ اسی کا مطیع اسی کا فرمانبردار ہوں مَیں زندگی کے ہر معاملے میں اس کی مدد اس کی حفاظت اور اس کی توفیق کا محتاج ہوں۔ اور جب یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچتی ہے کہ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ

اَلْيَقِيْنُ۔

تو اس کی اطاعت شعاری کا اعتراف اور اس کی عبادت و بندگی کا عمل وقتی اور عارضی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ کہ مرتے دم تک اسی بندگی کی روش پر قائم رہوں گا۔

جب پوری زندگی اپنے رب کی اطاعت میں لگا دینے کا عزم او رجذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ میرے ذمے جو ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ اس لیے بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے دونوں پہلوؤں میں اس کی بندگی اور اطاعت کا عمل دخل ہو۔ اب وہ جہاں یہ دیکھتا ہے کہ رب کے ساتھ میرا معاملہ کھرا ہے وہاں یہ بھی سوچتا ہے کہ مخلوق کے ساتھ میرے معاملات درست ہوں۔ یہ سوچ اسے ترک دنیا اور رہبانیت پر تو کیا ابھارے گی۔ اسے معاشرے کا مفید ترین فرد بن کر زندہ رہنے پر مجبور کرے گی۔ جونہی کوئی داخلی یا خارجی قوت اسے بے راہ کرنے پر آمادہ کرے گی۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلے گا۔

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں۔ عبودیت کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ حب تام اور عجز کامل۔

اس مراقبے میں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ رب العلمین کے سامنے سربسجود ہے، شجر حجر، حیوان، انسان، ملائکہ، جن۔ سب اپنا اپنا سر سجدہ میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاص کیفیت ہوتی ہے اور کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو حقیقت سے بالعموم دور جا پڑتی ہے

ذاق من ذاق

مراقبہ فنا و بقاء

اس مراقبہ کا وظیفہ ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ (۵۵:۲۶)

مراقبہ عبودیت میں سالک محسوس کرتا ہے کہ یہ عظیم کائنات اس کی ہر چیز اس وحدہٗ لا شریک کے سامنے سربسجود ہے اور سبحان ربی الاعلیٰ کی ایک گونج سنائی دے رہی ہے۔ مراقبۂ فنا میں سالک محسوس کرتا ہے کہ ہر چیز غائب ہو گئی۔ شجر حجر حیوان انسان کچھ بھی موجود نہیں بلکہ سالک کو اپنے وجود کا احساس بھی نہیں رہتا۔ یہ فنا کی کیفیت ہے مگر ہر سالک کی تفصیلی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ یہ کیفیت کل من علیہا فان پر تفکر کے مراقبہ سے پیدا ہوتی ہے پھر جب سالک اس کے دوسرے حصے میں تفکر کرتا ہے۔ اور اس میں ڈوب جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ کائنات میں اگر کچھ ہے تو اسی ذات وحدہٗ لا شریک کے تجلیات و انوار کا فیضان ہے۔ یہ کیفیت مراقبۂ بقاء کی ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ کیفیت کا کماحقہٗ بیان ممکن ہی نہیں۔ آپ ذرا شہد اور اس ذائقہ کی کیفیت کسی ایسے آدمی کے سامنے پیش کریں جس نے شہد دیکھا ہو نہ چکھا ہو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے بیان کو سن کر وہ شہد کی حقیقت اور اس کے ذائقے کو کماحقہٗ سمجھ لے گا۔ آپ اپنا زورِ کلام صرف کرکے اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت کے قریب لا سکتے ہیں مگر اس کیفیت کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی طرح خوشی یا غم کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ مگر اس کیفیت کی حقیقت بیان میں نہیں آ سکتی۔

فناء و بقاء سالک کی دو کیفیتیں ہیں جب انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا گیا تو دو فلسفے وجود میں آ گئے یعنی وحدت الوجود اور وحدت الشہود۔ پہلے نظریے کا غلبہ زیادہ ذہنوں پر رہا پھر باہم تکرار اور مباحثے ہوئے مگر کیفیات میں استدلال کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

ہر آں معنی کہ شد از ذوق پیدا
کجا تعبیر لفظی یابد او را

بات اتنی ہے کہ سالک نے فناء کے مراقبے میں یہ محسوس کیا کہ کائنات کی ہر چیز فنا ہو گئی ہے اور مراقبہ بقاء میں محسوس کیا کہ بقاء صرف اس ذاتِ اقدس کو ہے جس کے انوار و تجلیات سے کائنات پُر ہے اور ان کے بغیر اور کچھ نہیں۔

اگر اس کیفیت کو استدلال کے دائرے میں ہی گھسیٹ کر لایا جائے۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی وجود صرف واجب کا ہے۔ ممکن اپنے وجود میں واجب کا محتاج ہے اور محتاج کا ہونا نہ ہونا برابر۔ اس لیے موجود حقیقی صرف واجب ہے مگر ممکن بھی معدوم نہیں بلکہ اس کے مقابلے میں کالمعدوم ہے۔

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں۔

"فناء بقاء شہودی ہے وجودی نہیں کیونکہ بندہ فنا نہیں ہوتا نہ ہی حق تعالیٰ کے ساتھ متحد ہوتا ہے بندہ ہمیشہ بندہ ہے اور خدا ہمیشہ خدا ہے وہ لوگ غلط ہیں جو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے وجودی تعینات کو رفع کرکے اپنی اصل کے ساتھ جو کہ تعینات و قیود سے پاک ہے، متحد ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ

سے فانی ہو کر اپنے رب کے ساتھ بقاء حاصل کر لیتا ہے۔
جیسے قطرہ اپنے آپ سے فانی ہو کر دریا سے مل جاتا ہے
اور اپنی قید کو رفع کر کے مطلق کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے۔
اعاذنا اللہ سبحانہ من معتقداتھم السوءۃ۔

"فناء کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ماسوی اللہ کو بھول جائے
اور حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کی گرفتاری نہ رہے اور سینہ و دل
کا میدان اپنی تمام مرادوں اور خواہشوں سے پاک و صاف ہو جائے
جیسا کہ مقامِ زندگی کے مناسب ہے اور مقامِ بقاء کے مناسب
یہ ہے کہ انفسی آیات کے مشاہدہ کے بعد بندہ اپنے مولیٰ
جل شانہٗ کی مرادوں پر قائم رہے اور حق تعالیٰ کی مرادوں کو
عین اپنی مرادیں معلوم کرے۔"

(مکتوبات دفتر دوم مکتوب ص۹۹)

اس مراقبے کا مقتضیٰ کیا ہے؟ از مولانا تھانویؒ ملخصاً

"فنا کا اثر یہ ہے کہ معاصی اور نامرضیات کے متعلق تقاضائے نفس
فنا ہو جائے۔ جب تک نفس کا تقاضا فنا نہیں ہوتا وہ فضولیات اور
شہوات میں فنا کرتا رہتا ہے۔"

معاصی کی طرف بالکلیہ میلان جاتا رہنا ضروری نہیں اور آسان بھی
نہیں البتہ نفس کا تقاضا کھونے کی ضرورت ہے۔

فناء سے پہلے معصیت کی طرف سے نگاہ کا روکنا مشکل تھا۔ اب
معصیت کا قصد نہیں ہوتا۔ یعنی کوئی منظر سامنے آ جائے تو سر نیچا ہو جاتا
ہے۔ اس کا نام مقام فنا ہے۔

بقاء

فنار میں حال کا غلبہ ہوتا ہے۔ بقار میں آکر وہ حال مغلوب ہو جاتا ہے اور سکون ہو جاتا ہے اور وہ حالت مبتدی کی سی ہوتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلے خالی تھا اب پُر ہو گیا پہلے فیض خود لیتا تھا اب اس سے دوسروں کو فیض پہنچے گا۔

اس مراقبہ کے راسخ ہو جانے پر یہ خوشگوار اثر پڑتا ہے کہ اصولِ تجویز سے انسان کلیتہً دست بردار ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کا رہنما اصول اصولِ تفویض ہو جاتا ہے۔

فنار بقار کی بحث کرتے ہوئے التکشف میں مولانا تھانویؒ اس کی حقیقت اور زندگی پر اس کے اثرات بیان کرتے ہیں۔

"فنا دو قسم ہے فنائے واقعی اور فنائے علمی۔ فنائے واقعی یہ ہے کہ افعال ذمیمہ اور ملکاتِ ردیہ زائل ہو جائیں مثلاً ظاہری معاصی چھوٹ جائیں قلب سے حبِ غیر اللہ، حرص، طول، املٔ کبر، عجب اور ریا وغیرہ سب نکل جائیں اس کو فنائے واقعی اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے جو چیز زائل ہوتی ہے یعنی افعال و ملکات ردیہ وہ واقع میں بھی فنا ہو گئے اس کو اصطلاحاً فنائے حسّی یا فنائے حسی بھی کہتے ہیں۔

فنائے علمی یہ ہے کہ غیر اللہ اس کے قلب سے مرتبۂ علم میں نکل گیا یعنی اس کو غیر اللہ کے ساتھ تعلق علمی نہ رہا بایں معنی کہ جیسا التفات و استحضار غیر کا پہلے تھا وہ نہ رہا بلکہ ملکۂ یادداشت

کا راسخ ہو گیا اور غیر سے ذہول ہو گیا۔ جیسا محبت مجازی میں
بھی غلبہ کے وقت ایسا ہی ہوتا ہے کہ محبوب دل میں زیادہ
بسا رہتا ہے۔ غیر کی طرف کسی بڑی ہی ضرورت سے توجہ
ہوتی ہے۔ ورنہ گنجائش نہیں ہوتی۔

پھر اس کے مراتب حسبِ استعدادِ سالک مختلف ہوتے
ہیں حتیٰ کہ کسی کو استغراق محض ہو جاتا ہے، کسی پر سکر غالب
ہوتا ہے۔ کوئی مجذوب محض ہو جاتا ہے۔ کوئی پھر بعض احوال
کی تکمیل کے لیے یا دوسروں کی تکمیل کے لیے علم بالاشیاء کی
طرف عود کر آتا ہے۔ اس آخری حالت کو بقاء کہتے ہیں۔

قسم اول کا فائدہ ظاہر ہے کہ مضرات شرعیہ کا ترک ہے۔
جس کو تقویٰ کہنا چاہیئے۔ اور قسم ثانی کا فائدہ یہ ہے کہ یہی
علم بالاشیاء بعض اوقات مفضی الی المعاصی ہو جاتا ہے پس
اسبابِ بعیدہ سے بچنا تقویٰ کا کمال ہے۔"

اس سلسلے میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے نظرۂ فنا اور عقیدہ
صحو کا اجمالی بیان خالی از فائدہ نہیں ہو گا۔

فنا کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل فنائے صفات و خصائص ذاتی و اوصاف
طبعی ہے تاکہ بندہ اتباعِ شریعت میں اپنی خواہشات کی بجائے اللہ کی مرضی
پہ عامل ہو سکے اور نفسِ امّارہ کی خواہشوں کو فنا کر کے احکامِ خداوندی پر
عمل کر سکے۔

دوسری منزل یہ ہے کہ بندہ لذاتِ حسّی سے کنارہ کش ہو جائے یہاں
تک کہ جب وہ اتباعِ شریعت کرے تو اس پر کسی فخر و مباہات کا اظہار بھی

نہ کرے۔ فنا کی یہ منزل ذہنی اور باطنی زندگی سے متعلق ہے۔
تیسری منزل یہ ہے کہ شعور بھی فنا ہو جائے کہ مجھے خدا کی حضوری حاصل ہے اس حالت میں اگرچہ مادی جسم باقی رہتا ہے مگر شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔
فنا کی اس آخری منزل پر پہنچ کر سالک باقی باللہ کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یعنی بقا باللہ، فنا فی اللہ کا ثمرہ ہے۔ اس بقا باللہ کی حالت میں بھی سالک ذاتِ باری کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ خدا کے ساتھ تو ہے مگر خدا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں بھی بندہ بندہ ہی رہتا ہے خدا وراء الوراء ہے۔کوئی بندہ کنہ ایزدی سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔نہ خدا کے ساتھ متحد ہو سکتا ہے۔
نظریۂ فنا سالک آخری منزل نہیں اگر سالک جذب یا سکر سے مغلوب ہو جائے۔ تو اُسے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔کیونکہ وہ ان فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ جو معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے بندے سے اس بات کا بھی طالب ہے کہ وہ جس سوسائٹی میں رہتا ہے اس کے حقوق و فرائض پُوری توجہ سے ادا کرے جب بندہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ کے مقام کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ حالت سکر سے حالتِ صحو میں واپس آ جاتا ہے۔ اور فناء کے بعد پھر انسانی یا انفرادی صفات اختیار کر لیتا ہے۔ اور چونکہ اس کی شخصیت میں صفاتِ ایزدی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے ہم جنسوں کے لیے اُسوہ (نمونہ) بن جاتا ہے۔یعنی وہ اپنے اعمال سے دوسروں کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح صحیح معنوں میں شریعت کا اتباع کریں۔
(ملخصاً۔ از رسائل جنیدؒ۔ بحوالہ تاریخ تصوف)

گویا اس مراقبے کا تقاضا یہ ہے کہ سالک اپنے ارادہ کو اپنی پسند کو فنا کر دے۔ اللہ کا ارادہ اور اس کی پسند باقی رہ جائے۔ سالک کی پسند اللہ کی پسند کے تحت ہو جائے۔ یہ وہی صورت ہے جس کی نشاندہی حدیث نبویؐ میں کی گئی ہے کہ

ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ ویدہٗ التی یبطش بہا و رجلہ التی یمشی بہا۔ (بخاری)

"اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتٰی کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور جب میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ سُنتا ہے اور اس کی بینائی ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے"

مراد یہ ہے کہ سالک کے تمام اعضاء اللہ تعالٰی کے ارادے اور پسند کے تحت حرکت کرنے لگتے ہیں۔

مجلسِ ذکر (۹)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مراقبۂ سیر کعبہ

گزشتہ مجلس میں بیان ہو چکا ہے کہ تعلق مع اللہ کے مختلف درجے ہیں۔ ابتداء میں سالک کو اس تعلق کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے پھر اس کے اندر ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ تدابیر اختیار کرتا ہے۔ جن سے تعلق مع اللہ پیدا ہو۔ ترقی کرے اور راسخ ہو جائے۔ اس رُخ بڑھنے کو اصطلاح میں سیر کہا جاتا ہے۔ پھر اس سیر کے بڑے بڑے دو حصے ہیں۔ اوّل سیر الی اللہ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا شفا ہوئی تو ذکر و شغل سے اس کو قوی بنایا گیا باطن انوارِ ذکر سے معمور ہو گیا رکاوٹیں دُور ہوئیں۔ اخلاقِ رذیلہ جاتے رہے۔ اوصافِ حمیدہ پیدا ہوئے نیکی کی طرف رغبت بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ نیکی کا جذبہ طبیعتِ ثانیہ بن گیا۔ عبادات میں سہولت ہونے لگی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی فکر ہونے لگی۔ گویا

اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو گیا۔ نسبت حاصل ہو گئی۔ سیر الی اللہ ختم ہوئی اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں تفکر و تدبر ہونے لگا تو حسبِ استعداد صفات کا انکشاف ہونے لگا اسرار و احوال کا وِرد ہونے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات غیر محدود ہیں۔ اور اس کی ذات حدِ ادراک سے باہر ہے لہٰذا یہ سیر فی اللہ بھی غیر محدود ہے۔اسی کے متعلق کہا گیا ہے ؎

بحریست بحرِ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
اینجا جزآنکہ جاں بسپارند چارہ نیست

سیر کا لفظ سنتے ہی ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ ایک کو چھوڑنا ہے دوسرے کی طرف بڑھنا ہے اور سیر الی اللہ سے یہ بات تو سامنے آتی ہے۔ کہ اللہ کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر چھوڑنا کسے ہے ؟ اس بات کی سمجھ اس صورت میں آئے گی کہ پہلے اپنے سرمایہ پر تو نگاہ کرو۔ اپنے مشاغل کا جائزہ لو۔ اپنی دلچسپیوں پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ چھوڑنا کسے ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان خواہشات کے پھندے میں بُری طرح پھنسا ہوتا ہے تمناؤں کی دلدل میں دھنسا ہُوا ہوتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہجرت کرکے سیر الی اللہ کا آغاز کرنا ہے۔ اسی مقام کی نشاندہی کرتے ہُوئے ارشاد ہوتا ہے۔

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ
وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشَاوَۃً
فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مَنْ بَعْدِ اللّٰہِ۔ (۴۵ : ۲۳)

یعنی کیا آپ نے اس شخص کی محرومی پر بھی غور کیا جو اپنی خواہشات پر

ایسا لٹو ہُوا کہ اُنہیں معبود ہی بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے اس نے گمراہی قبول کی۔ بصارت ہے مگر دیکھنا نصیب نہیں سماعت ہے مگر سُننا گوارا نہیں جس نے اللہ کو چھوڑ کر خواہشات کو معبود اور محبوب بنا لیا۔ اسے ہدایت کہاں سے ملے گی۔

سیر الی اللہ یہ ہوئی کہ اپنی جھُوٹی انا کے خول سے نکلو۔ خواہشات کی غلامی چھوڑو۔ اپنی ذات کے گرد گھُومنا ترک کرو۔ اور بڑھو اس ذات کی طرف جو تم سے اتنی محبّت کرتی ہے کہ خود تمہیں اپنی ذات سے اتنی محبّت نہیں بلکہ تم تو ایسے بھولے بھالے ہو کہ محبّت کے رنگ میں اپنے آپ سے دُشمنی کر رہے ہو۔ اور ایسی دشمنی کہ کوئی دُوسرا بھلا تم سے کیا دُشمنی کرے گا۔

سیر فی اللہ اس کی صفات کے بحرِ ناپیدا کنار میں تفکر ہے اور اس تفکر کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو وہ حال بن جائے۔ اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا تمہارے لیے آسان ہو جائے۔

سیر کعبہ کا مراقبہ سیر فی اللہ اس حیثیت سے ہے کہ کعبہ جو بظاہر پتھروں کی چوکور عمارت ہے۔ جسے خالق نے "قیاما لِلنّاس" اور "مثابۃ لِلنّاس" بنایا ہے در اصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ مسجودیت کا مظہر ہے وہ ذات مسجود ہے، اور اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے سامنے سجدہ ہو مگر وہ سامنے آئے کیونکہ وہ تو بے چون و بے چگون ہے۔ جسم، مکان و زمان سے پاک ہے۔ تو اس نے اپنی صفتِ مسجودیت کے مظہر کے طور پر کعبہ کو انتخاب فرمایا اور حکم دیا کہ

فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

سامنے مظہرِ مسجودیت ہے سجدہ مسجود کو ہو رہا ہے ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

سجدہ کی حالت انسان کے انتہائی عجز اور تذلل کے اظہار کی صورت ہے۔ مگر اس صورت کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انسان کو اپنے رب سے زیادہ قرب اس حالت میں حاصل ہوتا ہے جب اس نے اپنا سرِ نیاز اپنے رب کے سامنے زمین پر رکھا ہو تو سجدہ کیا ہے؟ انتہائی پستی کی حالت میں انتہائی بلندی کا حصول ہے اپنے رب سے ملاقات کی تقریب ہے۔ اس کے قرب کی صورت ہے تو اس عظیم عمل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس کے شایانِ شان تیاری بھی کرلے۔ کسی عظیم شخصیت کی ملاقات کو آدمی جائے تو نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہن کے جاتا ہے۔ مادی ملاقاتوں کے لیے مادی طہارت لازمی تصور کی جاتی ہے۔ آدمی رب العالمین کے دربار میں جاتے ہوئے کچھ رُوحانی طہارت کا بندوبست کرنا بھی لازمی سمجھے۔ رُوح اور باطن کا میل اور زنگ معصیت ہے اور اس کی صفائی کے لیے توبہ کا عمل ہے تو اس مراقبے میں سالک کی رُوح مقام ملتزم کے ساتھ چمٹ کر رو رو کر کہتی ہے ؎

اِلٰهِیْ عَبْدُكَ الْعَاصِیْ اَتَاكَ
مُقِرًّا بِالذُّنُوْبِ وَقَدْ دَعَاكَ
وَاِنْ تَغْفِرْ فَاَنْتَ لِذَاكَ اَهْلٌ
وَاِنْ تَطْرُدْ فَمَنْ یَّرْحَمْ سِوَاكَ

اس کے بعد حجرِ اسود سے طواف کعبہ شروع ہوتا ہے۔ اور ہر شوط میں حجرِ اسود پر پہنچ کر اس عہد کی تجدید ہوتی ہے کہ میرے پروردگار میری

توجہات، میرے اعمال میری کوششوں کا مرکز، تیری رضا کا حصول ہے۔
اس مراقبے کا اثر سالک کی عملی زندگی پر یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کے اندر عبادتِ الٰہی کی رغبت اور اطاعت الٰہی کا شوق بڑھ جاتا ہے۔
اپنے عجز اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا مشاہدہ اور یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ اور شرک و بدعت سے ایسا تنفر پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے تصور سے بھی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔
حج کے موقع پر آپ نے یہ منظر دیکھا ہو گا۔ کہ ملتزم کے ساتھ لوگ چمٹے ہوئے ہیں ہاتھ پھیلائے رو رہے ہیں۔ چیخ رہے ہیں، بِلک رہے ہیں کسی کو وضع داری آڑے نہیں آتی۔ سوشل سٹیٹس رکاوٹ نہیں بنتا۔ بس رو رہے ہیں۔ معافیاں مانگ رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے بیتُ اللہ کے اس حصّے کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس سے مَس ہو بے اختیار گریہ طاری ہو جائے۔ مگر کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جو یہاں رو رو کے معافیاں مانگ رہا ہے اس سے پھر ساری عمر گناہ کا ارتکاب ہی نہیں ہُوا ؟ نہیں ایسی صورت مُشکل ہی نظر آئے گی تو پھر اسے بہروپ کیوں نہ کہیں نہیں اور ہرگز نہیں یہ بہروپ نہیں یہ انسان کا اصل رُوپ ہے اور بھُول جانا انسان کی فطرت ہے۔ بھلا صاف ستھرا لباس پہننے والے کے کپڑے دُھلنے کے بعد کبھی میلے نہیں ہوئے؟ یقیناً ہوئے ہیں مگر پھر دھلائے جاتے ہیں ہاں یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ کہ صاف سُتھرا لباس پہن کر آدمی بڑے شوق سے غلاظت میں چھلانگ لگا دے۔ بلکہ غلاظت سے بچنے کی انتہائی کوشش کے باوجُود داغ دھبّے نہ سہی گرد و غبار سے تو کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو جسم کے پسینے اور اندرونی میل کا اثر تو لباس پر ظاہر ہو کے ہی رہتا ہے۔

رَبُّ الْعَالَمِیْن کے نمائندے رحمۃ للعالمینؐ نے ہم گناہگاروں کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے ایسا ہی مژدہ سنایا ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یحکی عن ربہ عزوجل قال اذنب عبدی ذنبا فقال اللھم اغفرلی ذنبی فقال تبارك وتعالیٰ اذنب عبدی ذنبا فعلم انہ ربا یغفر الذنب و یأخذ بالذنب ثم عاد فاذنب فقال ای رب اغفرلی ذنبی فقال تبارك وتعالیٰ عبدی اذنب ذنبا فعلم انہ ربًا یغفر الذنب و یأخذ بالذنب ثم عاد فاذنب فقال ای رب اغفرلی ذنبی فقال تبارك وتعالیٰ اذنب عبدی ذنبا فعلم انہ ربا یغفر الذنب و یأخذ بالذنب اعمل ماشئت قد غفرت لك۔

"یعنی حضورؐ حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں کہ ایک بندہ نے گناہ کیا اور کہا اللہ! میرا گناہ بخش دے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندے نے گناہ کیا اور اتنا سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی پروردگار بھی ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ کچھ مدت بعد پھر گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے ربّ مجھے بخش دے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ پھر کچھ مدت

بعد بندہ گناہ کرتا ہے اور یہی کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔"

اس آخری جملہ سے اگر کوئی کج بیں یہ سمجھے کہ گناہ کی کھلی چھٹی ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

شعر مرا بمدرسہ کہ برد

یہ بندہ نوازی کے اظہار کا انداز ہے۔ یہ اعزاز و شرف بتانے کا اسلوب ہے۔ یہ خطا کے پتلے انسان اور غفور و رحیم پروردگار کے درمیان جو تعلق ہے اس کی کیفیات ہیں جو ایسے رب کو پہچان نہ سکے وہ بھلا اس کی بندہ نوازی کی اداؤں کو کیا سمجھے اس جملے میں عفو و کرم کی جو دُنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔ اس کا احساس وہی کر سکتا ہے جسے ایسے رحیم و کریم ربّ کے ساتھ محبّت کا تعلق ہو ؎

ترا گاہے گریبانے نہ شد چاک
چہ دانی لذّت دیوانگی را

مغفرت کا تعلق گناہ سے ہے۔ گناہ کا صلہ عذاب ہے اور گناہ کا علاج توبہ ہے اور توبہ کا محرک ایمان باللہ ہے۔ نجات کا مدار ایمان پر ہے ہاں درجات کا مدار عمل صالح پر ہے۔ جب ایمان باللہ موجود ہے تو مغفرت کی توقع ظاہر ہے اور جب مغفرت ہو گئی تو نجات یقینی ہے۔

مراقبہ سیر صلوٰۃ

سیر کعبہ میں یہ یقین پختہ ہو گیا کہ مسجود وہی ہے اور اپنی ذات

اور اپنی خواہشات کے گرد گھومنے کی بجائے سالک کی توجہات او کوششوں کا محور اور مرکز مسجود حقیقی ہی بن گیا۔ توبہ سے طہارت باطنی بھی کر لی اور مسجود حقیقی کی صفت مسجودیت کے مظہر کے گرد طواف بھی کر لیا۔ تو اب قدم آگے بڑھنا چاہیئے۔ کہ صرف سجدہ کرنا مطلوب نہیں بلکہ اس طرزِ خاص سے سجدہ مطلوب ہے۔ جو مسجودِ حقیقی نے بتایا اور اس کے آخری رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اس سلیقے سے سجدہ کرنے کا نام صلوٰۃ ہے۔

اس مراقبہ میں سالک کو چار باتوں پر توجہ مرکوز کرنا ہوتا ہے۔ اوّل یہ مظہرِ مسجودیت سامنے ہو اور توجہ ذات کی طرف ہو۔ دوم یہ کہ اظہارِ عجز کے لیے ترتیب اور تدریج ملحوظ ہو سوم حالت رکوع سے چہارم حالتِ سجدہ سے یعنی ہر حالت میں سالک کے سامنے اس کی رضا ہو اور سالک کے دل میں اس کی محبت ہو۔ دائمی توجہ الی اللہ مومن کی معراج ہے۔

شاید حضورؐ کے فرمان

الصّلوٰۃ معراج المؤمنین

کا مصداق یہی ہو۔

اس مراقبے کا اثر یہ ہے کہ سالک اپنے مسجود کے سامنے سجدہ کا سلیقہ غیروں سے نہیں سیکھتا۔ صلوٰۃ کا مفہوم لغت سے تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے دل کے کانوں میں یہ صدا ہی گونجتی ہے کہ

صلو کما رایتمونی اصلی

کہ محسنِ انسانیتؐ نے یہی سکھایا کہ اظہارِ عجز کے لیے مالک کے سامنے

سجدہ کرنے کا سلیقہ مجھ سے سیکھو۔ غور سے دیکھو جیسے میں نماز ادا کرتا ہوں ویسے ہی تم بھی ادا کیا کرو۔

دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ عبادات نافلہ کا اشتیاق بڑھنے لگتا ہے۔ قربِ الٰہی میں ترقی کا ذریعہ ہے۔ معاصی سے حفاظت، رزائل سے نفرت۔ فضائلِ اخلاق کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

توجہ الی اللہ اور سجدہ کی کیفیت یعنی بندہ کی طرف سے تذلل اور عجز اور اللہ تعالیٰ کی عظمت پوری زندگی پر چھا جاتی ہے۔ یہ قربِ الٰہی کی کیفیات کی سیر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

سیرِ قرآن

اس مراقبے میں سالک سب سے پہلے نزولِ قرآن کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (۲۶ : ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴)

یعنی اس کتاب کے نازل کرنے والا رب العالمین ہے۔ اور یہ نازل ہوا رحمت للعالمین کے قلب اطہر پر۔ اور اسے لا کے پہنچانے والا رُوح الامین ہے۔ تاکہ ہادی برحق کو انذار کا سامان مہیا کیا جائے۔ اس حقیقت پر غور کرتے ہوئے سالک اپنے قلب پر دھیان کرتا ہے کہ قرآن میں تدبّر و تفکّر کرنے کی برکت سے سالک کا قلب بھی مہبط انوارِ الٰہی بن جائے۔ ہدایت کا سرچشمہ بن جائے۔ امانتِ الٰہی

کے قابل ہو جائے۔عملِ تنزیل کی صورت سالک کو یوں محسوس ہوتی ہے کہ جیسے اس کے دو حصے ہیں۔ حضورؐ کے قلبِ اطہر پر قرآن مجید کا نزول ہو رہا ہے۔ اور حضورؐ کے قلبِ اطہر سے قرآن کا فیض دو صورتیں اختیار کرتا ہے۔ لسانِ نبوت سے علماء ربانی کی وساطت سے الفاظ قرآن کا فیض سالک کے قلب پر آ رہا ہے۔ اور حضورؐ کی توجہ سے مشائخ کی وساطت سے مفہوم قرآن اور رُوحِ قرآن کا فیض سالک کے قلب پر نازل ہو رہا ہے اس فیض کا اثر تلذذ، تحیر، شرح صدر، تفصیل، تفسیر، تشریح، علمی نکات اور عملی تحریک کی صورت میں اس انداز سے محسوس ہوتا ہے۔کہ اسی کے ذریعے نجات ابدی۔ اور سعادت ابدی حاصل ہو سکتی ہے۔

وہ یہ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے کہ کس طرح یہ کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر بذریعہ فرشتہ وحی حضرت رُوح الامین نازل کیا گیا ہے۔ اور قلبِ اطہر سے اس کا فیضان کس طرح بلسانِ نبوت پھیلا۔ اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کے قلوب میں یہ رحمت کس طرح راسخ ہوئی۔ اور اُن کے اعمال، افکار، اعضاء جوارح سے کس طرح اس کی برکات ظاہر ہوئیں۔

اس سے سالک کے ایمان باللہ، تصدیق قلبی میں ترقی ہوتی ہے اسے استقامت حاصل ہوتی ہے، مخلوق سے استغنا نصیب ہوتا ہے اور اللہ کا قربِ نصیب ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی نعمت لازوال سے حصہ پاتا ہے کہ جس کے فیضان میں انقطاع نہیں ترقی اور تسلسل ہے۔حتٰی کہ جنت میں

جانے کے بعد بھی وہ اس کلام کی برکات سے مستفیض ہوتا رہے گا اور وہاں بھی اس کی ترقی جاری رہے گی۔

وہ اپنے مالک سے محو گفتگو ہے، اس کا مالک اس سے خطاب کر رہا ہے۔ اور وہ سراپا سماعت بن گیا ہے۔ اس کی برکات نے اُسے گھیر لیا ہے وہ اپنی صفات سے فنا حاصل کرکے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ سے بقاء باللہ کا لطف حاصل کرتا ہے۔

پھر سالک مقصد نزولِ قرآن پر غور کرتا ہے اُسے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اُسے سنائی دے رہا ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ۔ (۱۷ : ۹)

یعنی یہ قرآن تو کتابِ ہدایت ہے یہ انسان کو جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے اس رستے پر چلاتا ہے۔ جس میں کوئی کجی نہیں جو سیدھا منزل تک لے جاتا ہے۔ اور منزل کون سی ہے؟ قربِ الٰہی، رضائے الٰہی، اطاعتِ الٰہی۔

پھر سالک یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے ایک شاہراہ اس کے سامنے ہے جس کے اس سرے پر سالک اپنے آپ کو کھڑا محسوس کرتا ہے اور دوسرے سرے پر جو منزل کی طرف ہے کھڑا کوئی آواز دے رہا ہے۔

هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ (۶ : ۱۵۳)

دیکھو سیدھا رستہ یہی ہے میرا رستہ یہی ہے۔ اسی پر چلے آؤ خیال رکھنا سیدھے چلے آنا۔ اس رستے کے دائیں بائیں کئی پگڈنڈیاں

پھُوٹتی ہیں۔ بڑے نظر فریب منظر ہیں۔کہیں اس راستے کو چھوڑ کر ان پُر فریب مناظر پر لٹو ہو کر اُدھر کا رُخ نہ کر لینا ورنہ بھٹک جاؤ گے منزل سے دُور ہو جاؤ گے۔نہیں بلکہ منزل کو کبھی پا ہی نہیں سکو گے۔ سالک یہ سوچتا ہے کہ یہ آواز کون دے رہا ہے اسے احساس ہوتا ہے۔ کہ آواز وہ دے رہا ہے جس کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

یعنی یہ کتاب صرف پہنچائے گا ہی نہیں بلکہ کتاب کی تعلیم بھی دے گا۔ کتاب کے الفاظ کا مفہوم بھی وہی بتائے گا۔ اس مفہوم کی عملی تعبیر بھی وہی بتائے گا بلکہ اس کتاب کی تعلیمات پر خود عمل کر کے دکھائے گا۔ اور اپنے شاگردوں سے اپنے سامنے اس پر عمل کرائے گا۔تاکہ بعد میں آنے والے الفاظ کی تعبیرات میں ہی نہ پھنسے رہیں۔

اس مراقبے کے مقتضیٰ پر عمل کرنے کی صُورت یہ ہوتی ہے کہ سب سے پہلے سالک قرآن کی تعلیمات کے آئینے مین اپنا جائزہ لیتا ہے ؎

زقرآں پیش خود آئینہ آویز
دگر گوں گشتۂ از خویش بگریز

اس جائزے کے بعد اپنی اصلاح کی کوشش میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے۔ مگر اصلاح تو عمل ہے اور یہ آئینہ الفاظ کا مجموعہ ہے۔لفظ اور عمل کے درمیان جو فاصلہ ہے یہی وہ نازک مرحلہ ہے جہاں سے لوگ غلط سمت اختیار کرتے ہیں۔ اس درمیانی فاصلے کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ کا صحیح مفہوم

معلوم کیا جائے پھر اس مفہوم کی جو عملی تشکل بنتی ہے اس کا نمونہ تلاش کیا جائے۔ الفاظ قرآن کا صحیح مفہوم صرف اسی کے پاس سے ملے گا۔جسے معلّم قرآن بنا کر انسانیت کی طرف بھیجا گیا اور اس مفہوم کی عملی شکل اور عملی نمونہ اُس جماعت کے عمل سے ملے گا جس کی تربیت خود معلّم قرآن نے کی اور جن کے متعلق قرآن بھیجنے والے نے اعلان کر دیا کہ معیاری نمونہ اور خدائی سٹینڈرڈ یہی ہے۔

وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ (۹ : ۱۰۰)

یعنی میرا قرب اور میری رضا اگر تمہاری منزل ہے تو سچے دل سے ان لوگوں کے پیچھے چلے آؤ۔ جن کو میرے رسولؐ محسنِ انسانیت نے ۲۳ برس تک ٹریننگ دے دے کر تیار کیا اور میں نے اُن کی زندگی میں ہی اعلان کر دیا کہ یہ لوگ میری رضا کے مقام پر پہنچ گئے گویا اس کا مقتضا یہ ہے کہ آدمی قرآن کا مفہوم قرآن پہنچانے والے سے سیکھے۔ اگر سمتھ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی حماقت کر بیٹھے گا۔ تو وہ اِتباعِ ھوٰی کی روش اختیار کرے گا۔ اور اس کا نتیجہ تو لازماً وہی ہو گا جو اس کی خصوصیت ہے کہ

فیضلك عن سبیل اللہ

یعنی اللہ کے راستے سے ہی ہٹ جائے گا۔ مگر ایسی مت ماری جائے گی کہ اس گمراہی کو ہدایت بلکہ عین ہدایت اور اصل ہدایت ہی سمجھے گا اور دوسروں کو ایسا سمجھنے پر مجبور کرے گا۔ اور اگر عمل کے لیے معلّم قرآن کے تربیت یافتہ گروہ کو چھوڑ کر اپنی پسند کا نمونہ پیش نظر رکھ لیا تو اللہ کی رضا کے مقام پر تو پہنچ نہیں سکتا۔ خطرہ ہے کہ کہیں اس کے غضب کا مستحق نہ بن جائے۔

ذاتی اصلاح کے بعد اس کا دوسرا مقتضا یہ ہے کہ
لَتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ۔
پر عمل شروع ہو جائے یعنی دعوت و تبلیغ پر توجہ مرکوز کر دے۔
علم و عمل کی جو دولت اس کتابِ ہدایت۔ یعنی قرآنِ حکیم سے حاصل ہوئی ہے۔ اسے ذخیرہ کرکے نہ رکھ دے۔ بلکہ اسے پھیلائے۔ عام کرے دوسروں تک پہنچائے تاکہ جن اللہ کے بندوں کو جہالت غفلت اور نادانی نے اللہ سے دُور کر رکھا ہے وہ اپنے رب کو پہچانیں۔ اس سے واقفیت حاصل کریں۔ تاکہ اس کے قریب ہونے کا اور اس کی رضا حاصل کرنے کا ارادہ اور شوق پیدا ہو۔ یہی وہ اصل کام ہے۔ جس کے لیے سالک کو تیار کیا جاتا ہے۔

مجلسِ ذکر (۱۰)

گزشتہ مجلس میں مراقبہ سیرِ کعبہ کے دوران مراقبہ سیرِ صلوٰۃ اور سیرِ قرآن کا بیان ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ الصلوٰۃ معراج المؤمنین یعنی یقین کامل کا تقاضا یہ ہے کہ سالک جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو یہ کیفیت ہونی چاہیئے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے رُوبرو کھڑا ہے اور اپنے رب سے ہمکلام ہے۔ یہ منظر معراج شریف کی رات کو رب العٰلمین اور رحمۃ للعالمین کے درمیان مکالمہ کی ایک جھلک ہے۔ اس رات اور اس مکالمہ کی یاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسی باعثِ راحت ہوئی تھی کہ جب حضرت بلال رضؓ کو اذان کا حکم دیتے تو فرماتے اَرِحْنِیْ یَا بِلَال یعنی اے بلال رضؓ میری راحت کا سامان کر۔

پھر سالک اور رب کے درمیان اس مکالمہ کا سلیقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے یوں سکھایا کہ صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ یعنی نماز یوں پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو۔

پھر سیرِ قرآن کے سلسلے میں بیان ہوا کہ قرآنِ حکیم اللہ کریم کی وہ نعمت ہے جس کا تعارف کراتے ہوئے اللہ کریم نے حضور اکرمؐ کو فرمایا کہ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (۱۴:۱) یعنی یہ کتاب ہم نے آپ پر اس لیے نازل کی کہ آپ اس کے ذریعے بنی نوعِ انسان کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کی نورانی دُنیا میں لا کھڑا کریں۔ تو دونوں نعمتیں حضور اکرمؐ کے ذریعے اللہ کے بندوں تک پہنچیں سالک کو جب اس کا احساس ہوتا ہے تو پہلے

تو بے اختیار اس کی زبان سے ۔۔۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی

مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

پھر اس کے کانوں میں یہ صدائے دلنواز گونجنے لگتی ہے کہ مَنْ حَجَّ وَ لَمْ يَزُرْنِىْ فَقَدْ جَفَانِىْ ۔ یعنی رحمۃ للعالمین فرما رہے ہیں کہ "جس نے رب العلمین کے گھر کی حاضری دی اور میری ملاقات کے لیے نہ آیا اس نے بڑی زیادتی کی" تو سالک کی رُوح اس حاضری کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے۔ اس لیے سیر کعبہ کے بعد ہے۔

مراقبۂ روضۂ اطہر

اس مراقبہ کا وظیفہ صلوٰۃ وسلام ہے اور اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سالک اپنے آپ کو روضۂ اطہر کے پاس مواجہ شریف کے سامنے ادب سے کھڑا محسوس کرتا ہے اور رُوح کی زبان سے پورے ذوق و شوق کے ساتھ دُرود و سلام پڑھتا ہے اور حضُور اکرمؐ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ آپ نے اس ناکارہ کو اپنے رب سے صرف آشنا ہی نہیں کیا بلکہ اس سے ہمکلامی کا شرف بھی بخشا۔

اس کے ساتھ سالک کے قلب میں ایک اور کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اسے یاد آ جاتا ہے کہ رب العالمین کمال شفقت سے فرما رہے ہیں:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۴ : ۶۴)

یعنی یہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو (اے نبیؐ) اگر تیرے پاس

آجائیں اور اللہ سے مُعافی مانگیں اور اللہ کا رسُولؐ بھی ان کے لیے مُعافی مانگیں تو وہ یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحمت کرنے والا پائیں گے. تو سالک سچے دل سے گڑگڑا کے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور حضُور اکرمؐ سے درخواست کرتا ہے کہ مُعافی لے دیں اور اس کے ساتھ ہی روزِ قیامت کو شفاعت کی درخواست کرتا ہے اور اس دوران سالک کی رُوح کی زبان پر مسلسل صلوٰۃ وسلام کا وظیفہ جاری رہتا ہے۔

اس مراقبہ کا اثر سالک کی زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ:

(۱) اس کے دل میں حضُور اکرمؐ کے احسانات کا احساس اس شدّت سے ہوتا ہے کہ اس کا قلب جھُوم جھُوم کے کہتا رہتا ہے۔ ؎

زندگی آپ کی عنایت ہے
ورنہ ہم لوگ مرگئے ہوتے

(۲) سالک کے قلب میں حضُور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت بڑھنے لگتی ہے اور اس کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ؎

قلب و دل و نگاہ کا مرشد اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُتکدۂ تصورات

اور یوں سمجھئے کہ سالک کے دل میں ایمان کی حلاوت محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کے کانوں میں یہ صدا گونجنے لگتی ہے کہ

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔

یعنی نبی رحمتؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو ایمان کی حلاوت نصیب ہی نہیں ہوتی جب تک اسے اپنے ماں باپ اولاد اور سب سے بڑھ کر مجھ سے

محبت نہ ہو۔

(۳) اس کا دل مادی اور جسمانی طور پر دیارِ حبیبؐ کی حاضری کے لیے بے قرار رہتا ہے اور دیوانہ وار کہتا پھرتا ہے ؎

کے بود یا رب کہ رو در یثرب و بطحا کنم
گاہ بمکہ منزل و گاہ در مدینہ جا کنم

اور جی چاہتا ہے کہ یہ آنے جانے کا سلسلہ قائم رہے۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں اپنا اپنا جدا لطف ہوتا ہے ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

مراقبۂ مسجد نبویؐ یا دربار نبویؐ

مراقبۂ روضۂ اطہر کے بعد مراقبۂ دربار نبویؐ کرایا جاتا ہے۔ اس مراقبہ کا وظیفہ کثرت درود شریف ہے۔

اس میں سالک یوں محسوس کرتا ہے کہ مسجد نبویؐ میں حضور اکرمؐ اپنے منبر شریف پر رونق افروز ہیں۔ سامنے صحابہ کرامؓ بیٹھے ہیں۔ ایک طرف بعد میں آنے والے اولیاء اللہ بیٹھے ہیں۔ سالک اپنے آپ کو اس مجلس میں بیٹھا ہوا محسوس کرتا ہے۔ نگاہیں جھکی ہوئی ہیں۔ اپنی بے مائیگی پر نگاہ ہے۔ اللہ کریم کی اس رحمت کے لیے سراپا شکر بنا ہوا ہے اور فرطِ محبت اور فرطِ مسرت سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے اور روح کی زبان پر درود شریف کے الفاظ رواں ہیں۔ اور اس کی روح زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

مراقبۂ فنا فی الرّسُول

دربارِ نبویؐ کی اسی نورانی محفل میں سالک یوں محسوس کرتا ہے جیسے میرا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے اور ہر ٹکڑے سے بلکہ رگ رگ سے نخ نخ سے ہر قطرۂ خوُن سے یہ آواز اُٹھ رہی ہے۔

اللھم صَلّ علیٰ محمّدن النبی الامّی وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ وبارك وسلّم

پھر کچھ دیر بعد وہی ٹکڑے اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں اور سالک کی زبان پر وہی دُرود شریف کے الفاظ جاری ہیں۔

اس مراقبے کا اثر جو سالک پر پڑتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے پہلے "فنا" کی حقیقت معلوم کرلینی چاہیئے۔ تصوّف میں فنا کے معنی معدوم ہوجانا یا مٹ جانا نہیں ہوتا۔ بلکہ فنا کے معنی اپنی انانیت کو مٹا دینا ہوتا ہے۔ اورجب لفظ فنا کے ساتھ فی الرّسول کا اضافہ کرکے ایک ترکیب فنا فی الرّسول استعمال کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سالک اپنی پسند و ناپسند کے معیار سے دستبردار ہوگیا ہے اور اسے نبی رحمت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پسند کے ماتحت کردیا ہے۔ تصوّف میں یہ مراقبہ نبی رحمتؐ کی اس حدیث پر عمل کرنے کا سلیقہ سکھانے کے لیے کرایا جاتا ہے۔ جس میں فرمایا: لا یؤمن احدکم حتی تکون ھواہ تبعا لما جئت بہ: یعنی تم میں کوئی شخص ایمان کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوسکتا جب تک اپنی تمام خواہشات کو میری تعلیمات کے ماتحت نہ کردے۔ خواہشات کی دُنیا میں اس تبدیلی کی دو صورتیں ہیں، ایک عملی دُوسری ذوقی۔ علمی صورت یہ ہے۔ کہ کسی مسئلہ میں دماغ ان دلائل کو قبول کرنے کیلے آمادہ ہی نہ ہو جو اس مسئلہ کے اِس پہلو کو ثابت کریں جو نبی رحمت کی پسند سے ہٹ

کر ہو۔ ذوقی صورت یہ ہے کہ دلائل کا نہ موقع آئے نہ ضرورت محسوس ہو۔ دل اس صورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو نبی رحمتؐ کی پسند سے ہٹ کر ہو۔ کیونکہ محبت کی دُنیا استدلال کی دُنیا سے بالکل مختلف نوعیت کی ہے۔ استدلال کی دُنیا میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ کام اس لیے کرنا ہے کہ اس میں یہ فوائد ہیں یا اس کام سے اس لیے باز آنا ہے کہ اس کے کرنے سے یہ نقصان ہو گا۔ محبت کی دُنیا میں نفع و نقصان کا مفہوم ہی دوسرا ہے اور پیمانہ ہی جُدا ہے۔ اس دُنیا میں ہر "کیوں" کا جواب صرف ایک ہوتا ہے۔ کہ یہ محبوب کو پسند ہے۔ اس لیے اس کا کرنا پسندیدہ ہے اور یہ محبُوب کو پسند نہیں اس لیے اس کا ترک کرنا ہی پسندیدہ ہے۔

اس مراقبہ کے پختہ ہونے کا سالک کی عملی زندگی پر یہ اثر پڑتا ہے کہ:

۱۔ محبت کا کوئی جعلی پیمانہ مقبول نہیں ہوتا بلکہ سرکاری پیمانہ ہی قابلِ قبول ہوتا ہے۔

۲۔ محبت کا سرکاری پیمانہ ہے، مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ یعنی جسے میری سُنّت کے ساتھ محبت ہے وہ مجھ سے محبت کرنے کے دعویٰ میں سچا ہے۔ اگر یہ نہیں تو وہ محبت نہیں صرف محبت کی اداکاری ہے۔

(۳) اس فکری اور ایمانی تبدیلی کے ساتھ عملی زندگی میں سالک کا معمول یہ بن جاتا ہے کہ عقائد ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا اخلاق زندگی کے ہر شعبے میں کوشش کرتا ہے کہ نبی رحمتؐ کی اداؤں اور طور طریقوں کو اپنائے۔ جہاں کوئی حرکت کر بیٹھے جو خلافِ سُنّت ہو تو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگے اور پھر سے اس مقام پر پلٹ آنے کے لیے سچے دل سے توبہ کرے۔ اللہ سے مُعافی مانگے اور اسے ندامت ہو کہ نبی رحمتؐ کے نقشِ قدم سے

ہٹ کر قدم کیوں اُٹھاؤں۔

(۴) سالک کی نگاہ وسیع ہو جاتی ہے۔ صرف اپنی ذات اور اپنے فوری مفاد پر ہی اس کی نگاہ نہیں جم جاتی بلکہ اسے اس بات کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے کہ مَیں کس طرح زیادہ سے زیادہ اللہ کے بندوں کی خدمت کر سکتا ہوں۔

(۵) اسے اِس حقیقت پر پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

مراقبہ رُوحانی بیعت

یہ خصوصیت صرف نسبت اویسیہ میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ رُوح سے اخذ فیض اور اجرائے فیض اویسیہ نسبت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ہمارا سلسلہ نقشبندیہ ہے یعنی ہمارے ہاں سالکین کی تربیت کا وہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو اکابر نقشبند کے ہاں مروّج اور مجرّب ہے۔ اس کے ساتھ ہماری نسبت اویسی ہے اس لیے رُوح سے اخذ فیض اور اجرائے فیض کے ہم صرف قائل نہیں بلکہ عملاً اس پر کاربند ہیں۔

اجرائے فیض کا سب سے بڑا مرکز نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ یہ دولت جس طرح جسدِ رحمۃ للعالمین سے بٹتی تھی اسی طرح رُوحِ رحمۃ للعالمین سے بٹتی ہے اور اس دولت کے بانٹنے اور اس سے جھولیاں بھرنے کی صُورت رب العالمین نے یہ بیان فرمائی کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (۴۸ : ۱۰)

یعنی (اے نبیؐ) جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت

کرتے ہیں تو رُوح سے اخذ فیض کی بھی یہی صورت اس مراقبے میں اختیار کی جاتی ہے۔ سالک کی رُوح میں لطائف کے راسخ ہونے اور مراقبات کی مشق سے قوتِ پرواز ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے سالک کی رُوح دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوتی ہے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ہاتھ حضور اکرمؐ کے دستِ اقدس میں دے کر بیعت کی نعمت سے مشرف ہوتی ہے۔ اور حضور اکرمؐ بیعت فرما کر اس کے ذمے دین کی خدمت کا وہ کام لگاتے ہیں جس کے کرنے کی اس میں اہلیت اور صلاحیت ہوتی ہے۔ تصوّف کی دُنیا میں سلوک کا یہ پہلا مقام ہے۔ یہاں سے دراصل مقاماتِ سلوک شروع ہوتے ہیں۔

اس مراقبے کا سالک کی عملی زندگی پر دو قسم کا اثر ہوتا ہے۔ ایک اصلاحِ ذات دوسرا خدمتِ خلق۔ یعنی ایک تو اس میں یہ تبدیلی آجاتی ہے کہ اپنے عیوب پر نگاہ پڑتی ہے جو اتنی بڑی تبدیلی ہے کہ نبی رحمتؐ نے فرمایا:

طوبیٰ لمن شغلہ عیبہٗ عن عیوب الناس۔

یعنی خوش قسمت ہے وہ انسان جسے اپنے عیب دیکھنے سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ دُوسروں کے عیب کا کھوج لگاتا پھرے۔ اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

نہ تھی حال سے اپنے جب کہ خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنے گناہوں پہ جب سے نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

اور اس نگاہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ دُوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے آشنا کرنے اور

اس کے عذاب سے بچانے کی تدبیروں اور عملی کوششوں میں اپنی ساری صلاحیتیں کھپا دینے میں راحت محسوس ہوتی ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ گویا سالک فکری اور عملی اعتبار سے نبی رحمتؐ کے رنگ میں رنگا گیا ہے۔ اس سے بڑی کسی نعمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اللهم ارزقنا حبك وحب حبيبك وحب عمل يقربنا الى حبك۔

حل مشکلات

صفحہ کتاب	لفظ	مطلب
-7	اعضاء و جوارح	اعضاء جمع عضو کی۔ جوارح جمع جارحہ کی۔ بدن کے حصے ہاتھ پاؤں وغیرہ۔
-11	بے چوں و چگون	جس جیسا اور کوئی نہ ہو۔
-14	حاذق	ماہر
-37	معتدبہ	بے شمار' حد سے زیادہ۔
-57	مطاع	جس کی اطاعت کی جائے' قائد' پیشوا۔
-71	انابت	اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔
-72	مفرط	حد سے تجاوز کرنے والا۔
-72	جہر متوسط	معتدل آواز سے ذکر کرنا۔
-80	تدبر تام	پوری اور مکمل توجہ۔
-80	مواظبت	کوئی کام مسلسل اور ہمیشہ کرنا۔
-80	القیاد و تفویض	تابع ہو جانا اور اپنے آپ کو اللہ کی مشیئت کے سپرد کر دینا۔
-100	مرجع	لوٹنے کی جگہ۔ جس اسم کی جگہ ضمیر استعمال ہو۔
-100	شناوری	تیرنا۔
-117	غرہ	غرور۔ اترانا۔
-118	استتار و تبطن	پوشیدہ ہونا۔
-118	قانون تکوینی	کائنات کا وہ نظام جس میں انسان کو دخل نہیں جمادات نباتات' حیوانات کا اللہ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق کام کرنا۔

119-	قانون تشریعی	کرنے اور نہ کرنے کے وہ احکام جن میں انسان کے ارادہ اور اختیار کا دخل ہے اس قانون کے مجموعے کو شریعت کہتے ہیں۔
121-	حب تام	کامل محبت۔
123-	شہودی	مشاہدہ میں آنے والی۔
125-	اصول تجویز	انسان کی یہ خواہش کہ جو کچھ ہو میری پسند اور میری مرضی کے مطابق ہو۔
125-	اصول تفویض	صرف اپنے فرائض کی ادائیگی کا فکر کرنا اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا اور جو نتیجہ نکلے اسے دل سے قبول کرنا۔
125-	استحضار	کسی چیز کی یاد دل میں موجود رہنا اور اس کا چشم تصور کے سامنے رہنا۔
126-	ذہول	ذہن سے اتر جانا۔ بھول جانا۔
126-	مفضی الی المعاصی	گناہوں کی طرف لے جانے والا۔
126-	صحو	ہوش میں رہنا۔
126-	فخر و مباہات	غرور کرنا۔ خوبی اور اچھائی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا۔
127-	حالت سکر	ہوش نہ رہنا۔ جیسے آدمی نشہ میں ہوتا ہے۔
127-	حالت صحو	باخبر رہنا۔ ہوش میں رہنا۔
138-	تلذذ	لذت حاصل کرنا۔

فارسی اشعار کا مفہوم

1- زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز۔
اگر حالات تیرے موافق نہیں ہوتے تو تو حالات کا مقابلہ کر جیسے دشمن کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے۔

2- تو خود حجاب خودی حافظا مخروش۔
حافظ شیرازی معرفت باری کے سلسلے میں ایک رکاوٹ کا ذکر کرتے ہیں تو خود بینی' خود پرستی اور خود نمائی کا شکار ہے۔ اللہ کی معرفت کیسے ہو۔ جب تک خود پرستی کا پردہ نہ ہٹے خدا پرستی کیسے آئے۔ یہ دراصل ایک حدیث کی ترجمانی ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

3- تراگاہے گریبانے نہ شد چاک چہ دانی لذت دیوانگی را۔
تیرا گریبان کبھی چاک ہی نہیں تجھے کیا خبر دیوانگی کی لذت کیسی ہوتی ہے۔

4- خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست
صوفی سمجھتا ہے کہ میں نے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ مگر اس کی محنت کا حاصل اس کے بغیر کچھ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ بلکہ سب کچھ سمجھنے لگا ہے۔

5- اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
اے سحر کے وقت شور کرنے والے مرغ۔ پروانے سے سیکھ محبت کسے کہتے ہیں۔ دیکھ اس نے جان دے دی جل گیا مگر آواز تک نہ آئی۔

6- باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست
اس درجے کی محبت کے باوجود ہم نے اپنا گریبان نہیں پھاڑا انتہائی درجے کی محبت میں بھی اپنے آپ سے باہر نہ ہونا ہر عاشق کا کام نہیں۔

7- بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اپنے آپ کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور محبت میں فنا کر دے۔ حضورؐ کی اطاعت اور محبت کے بغیر سب فضول' باطل اور بیکار ہے۔

8- غم چو بینی زود استغفار کن　　　غم بامر خالق آید کار کن

اگر تجھے کوئی رنج اور تکلیف پہنچے تو فوراً" اللہ تعالی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ تکلیف اللہ کے حکم سے آتی ہے تو اپنے کام میں لگا رہ۔

9- بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من انداز قدت را می شناسم

تو جس رنگ کا لباس چاہے پہن لے۔ میں تیرے قدو قامت کو خوب پہچانتا ہوں۔

مراد یہ ہے کہ آزمائش خواہ خوشی کی صورت میں آئے یا غم کی صورت میں میں خوب جانتا ہوں کہ یہ میرے اللہ نے بھیجی ہے۔ اس لیے میرا کام پہلی صورت میں شکر اور دوسری صورت میں صبر کرنا ہے۔

10- برگ درختان سبز در نظر ہوشیار　　　ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

ایک دانا آدمی جب درختوں کے سبز پتوں کو دیکھتا ہے تو اسے ہر پتہ اللہ کی معرفت کی ایک کتاب دکھائی دیتا ہے۔

11- ہر آں معنی کہ شد از ذوق پیدا　　　کجا تعبیر لفظی یا بد اورا

واردات قلبی جو وجدان ہی سے معلوم ہوتے ہیں انہیں لفظوں میں کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے۔

12- بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست　　　اینجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

محبت کا ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں جو محبت کے سمندر میں کودتا ہے اسے جان کی بازی لگانا ہی پڑتی ہے اس کے بغیر چارہ نہیں۔

13- شعرم بمدرسہ کہ برد۔

میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا۔ مراد یہ ہے کہ میرے شعر سمجھنے کے لیے لغت کی کتاب نہیں چاہیے۔ محبت آشنا دل درکار ہے۔

14- جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی　　　مرا باجان جاں ہمراز کردی

اے میرے شیخ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے محبوب یعنی رب ذوالجلال کی معرفت حاصل ہو گئی۔

15- ز قرآن پیش خود آئینہ آویز   دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز

قرآن کو آئینہ بنا کر اپنے سامنے رکھ اور اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ۔ تو تو بالکل مسخ ہو چکا ہے۔ اپنے آپ سے بھاگ۔ یعنی اس آئینے میں جو بگاڑ تمہیں اپنی صورت میں نظر آتا ہے اسے دور کر تاکہ تو صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بن جائے۔

-5	56:51
-6	19:96
-6	10:56
-10	43:7
-15	14:83
-29	4:60